دسویں جماعت کے لیے

S.S.B 4736

12 - 2011
9 - 1996
15
3

12 2011
03 1997
09 14

12 2011
1995
9 16

12 2011
09 1999
03 17

19/11/13

+

6

8

11

15

20

26

32

33

35

37 21

48

49

52

58

59

60

65

67

68

مادری زبان کے نئے نصاب کے مطابق

کمار بھارتی

اردو کی درسی کتاب

(دسویں جماعت کے لیے)

2007

مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ آف سیکنڈری اینڈ ہائر سیکنڈری ایجوکیشن، پونہ - ۴۱۱۰۱۰

سیکنڈری اینڈ ہائر سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ کے نئے نصاب کے مطابق مجلسِ ادارت نے
عربی، فارسی واوستا پہلوی بورڈ آف اسٹڈیز کی نگرانی میں اس کتاب کو ترتیب دیا ہے

بورڈ آف اسٹڈیز برائے اُردو، عربی، فارسی واوستا پہلوی : ڈاکٹر یونس اگاسکر (کنوینر)
ڈاکٹر ارشد جمال (رکن)
صغیر احمد غنی شیخ (رکن)
محمد تقی الدین عبدالرزاق دیگلوری (رکن)
رضیہ امجد خان (رکن)
عائشہ بی رکن الدین انعامدار (رکن)
ڈاکٹر امانت شیخ (مہمان رکن)
محمد علیم مختارے (مہمان رکن)
بشیر احمد انصاری (مہمان رکن)

مجلس ادارت : ڈاکٹر اقبال برکی
ڈاکٹر محمد اسد اللہ
محمد عمران انصاری
مظہر سلیم قریشی

رابطہ کار : بشیر احمد انصاری

پروڈکشن کنٹرولر : پرمود شرودکر

بورڈ ایویلیوایشن افسر : گووردھن سونونے ● پروڈکشن آفیسر : سنجے کامبلے ● اسسٹنٹ : راجندر پانڈلوسکر

ناشر : سیکریٹری، مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ آف سیکنڈری اینڈ ہائر سیکنڈری ایجوکیشن، پونہ ۱۰

طباعت و تقسیم : مہاراشٹر راجیہ پاٹھیہ پستک نرمتی وابھیاس کرم سنشودھن منڈل، پونہ ۴

کاغذ : 60 GSM کریم ووہ

کمپیوٹر کمپوزنگ : مدنی گرافکس، ۳۰۵، سوموار پیٹھ، پونے ۱۱ ● سرورق : چندر شیکھر بیگم

طابع : impressions, BGM. Ph:0831-2421232
(1.20)

بھارت کا آئین

تمہید

ہم بھارت کے عوام متانت و سنجیدگی سے عزم کرتے ہیں کہ بھارت کو ایک خود مختار، سماج وادی، غیر مذہبی عوامی جمہوریہ بنائیں اور اس کے تمام شہریوں کے لیے حاصل کریں.......

انصاف: سماجی، معاشی اور سیاسی

آزادی: خیال، اظہار، عقیدہ، دین اور عبادت (کی)

مساوات: بہ اعتبار حیثیت اور موقع

اور ان سب میں

اخوّت کو ترقی دیں جس سے فرد کی عظمت اور قوم کے اتحاد اور سالمیت کا تیقّن ہو۔

اپنی آئین ساز اسمبلی میں آج چھبیس نومبر ۱۹۴۹ء کو یہ آئین ذریعۂ ہٰذا اختیار کرتے ہیں، وضع کرتے ہیں اور اپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں۔

(ترجمہ: ترقی اردو بیورو کی کتاب سے)

عہد

بھارت میرا ملک ہے۔ سب بھارتی میرے بھائی اور بہنیں ہیں۔ مجھے اپنے وطن سے پیار ہے اور مَیں اس کے عظیم و گوناگوں وِرثے پر فخر محسوس کرتا ہوں۔ مَیں ہمیشہ اِس ورثے کے قابل بننے کی کوشش کروں گا۔ میں اپنے والدین، استادوں اور بزرگوں کی عزت کروں گا اور ہر ایک سے خوش اخلاقی کا برتاو کروں گا۔ میں اپنے ملک اور اپنے لوگوں کے لیے خود کو وقف کرنے کی قسم کھاتا ہوں، اُن کی بہتری اور خوش حالی میں ہی میری خوشی ہے۔

پیش لفظ

مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ آف سیکنڈری اینڈ ہائر سیکنڈری ایجوکیشن نے قومی نصاب ۲۰۰۰ء کے خاکے کی روشنی میں نویں جماعت سے بارہویں جماعت کے ریاستی نصاب اور اس کے مقاصد کو ازسرِنو مرتب کیا ہے۔ نئے نصاب کو ترتیب دینے میں دوسری ریاستوں کے تعلیمی نصاب کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ درسی مواد اور مشقوں کے متعلق سماج کی ہر سطح کے نمایندہ افراد اور ماہرینِ تعلیم کی آرا پر غور وخوض کیا گیا ہے اور اکیسویں صدی کے تقاضوں کے پیشِ نظر ضروری اجزا شامل کر کے تعلیمی نصاب کو آخری شکل دی گئی ہے۔ نئے نصاب کے مطابق درسی کتب کی تالیف میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ درسی مواد سے ماہرین کی توقعات کی عکاسی ہو اور اس میں عوام کی خواہشات کی جھلک بھی پائی جائے۔

ان کتابوں میں شامل متن کی تشریح میں 'معانی و اشارات' اور 'مشق و مطالعہ' کے تحت زبان و بیان کے نکات، تلمیحات و کنایات اور زبان کے تخلیقی استعمال کو جابہ جا اس طرح اُجاگر کیا گیا ہے کہ اعلا ادب کی تفہیم کے ساتھ زبان کے درست اور معیاری استعمال کا شعور پیدا ہو۔ شعر فہمی کے ذوق کو پروان چڑھانے کے لیے شاعرانہ اندازِ بیان کے لفظی و معنوی حسن کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کہیں مصرعوں کی تو کہیں شعروں کی تفہیم کی گئی ہے۔ اُردو کے شعری سرمایے سے کسی شعر یا مصرعے کے مضمون یا طرزِ بیان سے مماثلت رکھنے والے شعروں یا مصرعوں کی مثالیں دے کر مزید مطالعے کا شوق دلایا گیا ہے۔ نظم و نثر میں اگر کہیں قرآن و حدیث کے اشارے آگئے ہیں تو اصل متن کی طرف رجوع کرتے ہوئے اُن کے حوالے یا اقتباسات مع ترجمہ دیے گئے ہیں۔ قواعد، عروض اور صنعتوں کو مثالوں اور عملی مشقوں کے ذریعے ذہن نشین کرایا گیا ہے۔ زبان کے اِطلاقی استعمال پر بھی زور دیا گیا ہے۔ غرض کہ کتاب کو طالب علم کے لیے خود کفیل اور سہل المطالعہ بنانے کی امکان بھر کوشش کی گئی ہے۔

تعلیمی عمل میں خود آموزی پر زیادہ زور دیا جارہا ہے۔ اردو زبان کی درسی کتب میں خود آموزی کی ترغیب دینے اور اس کی مشق کو سہل بنانے کے لیے معانی و اشارات اور مشق و مطالعہ کے تحت جو اشارے دیے گئے ہیں اور وضاحتیں کی گئی ہیں، اساتذہ ان کی نشان دہی کریں اور ان درسی نکات پر طلبہ کا ردِّعمل معلوم کریں۔ ان پر سوالات کیے جائیں، بحث کی جائے اور نئی تکنیکوں کا استعمال کیا جائے۔ سوال کے پرچے میں بھی خود آموزی کے سوالات شامل کیے جائیں۔ جہاں ممکن ہو خود آموزی کے ...

ذرائع بھی استعمال کیے جائیں مثلاً زبانِ دانی کے کام تفویض (assign) کیے جائیں تا کہ طلبہ خود اپنے الفاظ میں مافی الضمیر ادا کرسکیں۔ جلسوں اور ملاقاتوں کی رپورٹیں تیار کرائی جائیں، معلومات جمع کرنے کو کہا جائے، پروجیکٹ دیے جائیں، لغت اور کتب خانے کی کتب استعمال کرنے پر زور دیا جائے اور اقتباسات پر نوٹ تیار کرائے جائیں۔

ایک ضروری بات: اس کتاب میں انجمن ترقی اُردو (ہند) اور قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان (نئی دہلی) کا تجویز کردہ املا اختیار کیا گیا ہے مثلاً ہندی کے الفاظ روپیہ، پیسہ، بھروسہ وغیرہ کو الف سے روپیا، پیسا، بھروسا اور عربی اور فارسی کے الفاظ اعلیٰ، ادنیٰ، تمغہ، تماشہ وغیرہ کو اعلا، ادنا، تمغا، تماشا لکھا گیا ہے۔ اسی طرح عربی کی تقلید میں اُردو میں غیر ضروری طور پر مستعمل ہمزہ کے استعمال کو محدود کیا گیا ہے۔ جہاں فصیح تلفظ میں امالہ ضروری ہے وہاں اسے لکھاوٹ میں بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ اساتذہ ان خصوصیات پر توجہ دیں، طلبہ کو توجہ دلائیں اور اس معاملے میں (خصوصاً کاپیاں اور پرچے جانچتے وقت) بے لچک رویہ نہ اپنائیں۔

اس کتاب کی کمپیوٹر کمپوزنگ کرتے وقت طلبہ کی سہولت کے پیشِ نظر قدرے بڑا فونٹ اختیار کیا گیا ہے لیکن کتاب کی جسامت اور متن کی ضخامت کو بڑھنے نہیں دیا گیا ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ اس کوشش کو بہ نظرِ استحسان دیکھا جائے گا۔

اسٹیٹ بورڈ اُن ادبا اور شعرا کا شکریہ ادا کرتا ہے جن کے اسباق اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا مسودہ تیار کرنے میں اردو بورڈ آف اسٹڈیز کے کنوینر اور اراکین، مجلسِ ادارت کے مرتبین و رابطہ کار، مبصرین، بورڈ کے عملہ اور انچارج افسر نے کافی محنت کی ہے۔ مہاراشٹر سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ ان سب کا شکر گزار ہے۔ ٹیکسٹ بک بیورو نے کتاب طبع کرانے اور طلبہ تک پہنچانے میں تعاون کیا ہے۔ مہاراشٹر راجیہ اسٹیٹ بورڈ، بیورو کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

Kalpande

ڈاکٹر وسنت کالپانڈے

چیئرمین، مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ آف سیکنڈری اینڈ ہائر سیکنڈری ایجوکیشن، پونے

پونہ

مورخہ: ۷/مارچ ۲۰۰۷ء

فہرست

حصۂ نثر

حصۂ نظم

① حضرت خدیجہؓ ایک مثالی خاتون

مائل خیرآبادی

ولادت: ۱۹۱۰ء　　وفات: ۱۹۹۸ء

مائل خیرآبادی کا اصلی نام محمد اسحاق تھا۔ ضلع سیتاپور کے قصبے خیرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اس کے بعد اسکول میں داخلہ لیا اور ورناکیولر سرٹیفکیٹ یعنی ساتویں کلاس کا امتحان پاس کیا۔ اُردو اور فارسی میں مزید قابلیت حاصل کرنے کے لیے نجی طور پر منشی کامل کا امتحان دیا۔ درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے اور خیرآباد اور دیگر مقامات پر مدرسی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد رسالہ 'الحسنات' کے ایڈیٹر کی دعوت پر رامپور چلے گئے اور ادارۂ الحسنات سے وابستہ ہوگئے۔ اس ادارے کے بچوں کے رسالے 'نور' کے ایڈیٹر رہے۔ اس کے بعد رامپور ہی سے انھوں نے عورتوں کے لیے اپنا ذاتی رسالہ 'حجاب' جاری کیا۔

مائل خیرآبادی بنیادی طور پر ایک ادیب تھے۔ انھوں نے بچوں اور خواتین کے لیے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی چند اہم تصانیف یہ ہیں: 'اسلامی نظام میں عورت کا مقام' 'اسلامی تہذیب وآداب' 'امّ المومنین حضرت عائشہؓ' 'پیارے رسولؐ کے پیارے ساتھی' 'حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ' 'زبان کا زخم' اور 'ہندوستانی عورت'۔

اپنی کتاب 'حضرت خدیجۃ الکبریٰ' میں انھوں نے امّ المومنین حضرت خدیجہؓ کی زندگی کے اُتار چڑھاو کے ساتھ ساتھ ان کے کردار کی عظمت، اخلاق کی بلندی، ایمان کی مضبوطی اور وفا و ایثار کے جذبے کی پختگی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اس

[illegible] اسی کتاب سے
[illegible]

اس زمانے میں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا شہر مکہ کی ایک معزز اور مال دار بیوہ تھیں۔ وہ ایک عقل مند اور باہمت خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنے باپ اور شوہر کی [illegible] بیوپار کی طرف توجہ کی اور کاروبار کو سنبھالا۔ جب تجارتی قافلے مکے سے تجارت کے لیے باہر جاتے تو ان کے ساتھ حضرت خدیجہؓ کا مال بھی ہوتا۔ قافلے کی واپسی پر حساب کتاب ہو جاتا اور فریقین کو نفع مل جاتا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے قبل اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ رہ کر تجارت میں اچھا خاصا تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ آپؐ کی صداقت، دیانت داری اور خوش معاملگی کا چرچا خاص و عام کی زبان پر تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے سنا تو کہلا بھیجا "آپ میرے شریکِ کار ہو جائیں۔"

حضورؐ نے اپنے چچا ابو طالب سے مشورہ کر کے منظور کر لیا اور حضرت خدیجہؓ کا مال لے کر شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ حضرت خدیجہؓ نے اپنے ایک غلام میسرہ اور ایک رشتے دار خزیمہ کو آپؐ کے ساتھ کر دیا۔ اس دفعہ تجارت میں دوگنا منافع ہوا۔ حضرت خدیجہؓ نے اپنے آدمیوں سے سفر کا حال پوچھا تو دونوں نے حضورؐ کے اخلاق اور پسندیدہ اطوار کی بے حد تعریف کی۔ حضرت خدیجہؓ کے دل میں آپ سے نکاح کرنے کا خیال آیا۔ انھوں نے اپنی ایک سہیلی کی معرفت نکاح کا پیغام بھیجا۔ آپؐ نے اپنے چچا ابو طالب سے ذکر کیا تو انھوں نے بھی پسند کیا اور حضرت خدیجہؓ سے آپؐ کا عقد ہو گیا۔

اب تک حضرت خدیجہؓ نے حضرت محمدؐ کو دور سے دیکھا تھا۔ حضورؐ کی دیانت، صداقت اور خوش اخلاقی کے چرچے سنے تھے۔ اب جو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو

حضور کو اخلاق حسنہ کے اس بلند مقام پر پایا جس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ کی توفیق شامل حال تھی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، حضور کی نیک صحبت سے متاثر ہوئیں اور پورے طور پر آپ کے رنگ میں رنگ گئیں۔ انھوں نے دیکھا کہ حضور یتیموں، غلاموں، بیواؤں اور غریبوں کی سرپرستی اور امداد کو پسند فرماتے ہیں تو انھوں نے اپنا سارا کاروبار اور اپنی تمام دولت حضور کے قدموں میں ڈال دی تاکہ حضور جتنا مال جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ حضرت خدیجہؓ نے دیکھا کہ حضور سادہ اور معمولی زندگی سے خوش ہوتے ہیں تو انھوں نے کسی تامل کے بغیر سادہ اور معمولی زندگی اختیار کرلی۔ خدیجہؓ کی جو دولت ذاتی آسایش پر خرچ ہو رہی تھی، خلقِ خدا کے کام آنے لگی۔ حضورؐ دیکھ رہے تھے کہ چچا ابو طالب کی مالی حالت اچھی نہیں ہے۔ ان پر گھر کے خرچ کا بہت زیادہ بوجھ ہے۔ اس لیے آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے علیؓ ابنِ ابی طالب کو اپنی کفالت میں لینے کا مشورہ کیا۔ حضرت خدیجہؓ فوراً راضی ہوگئیں۔ حضورؐ کے ساتھ حضرت علیؓ بھی حضرت خدیجہؓ کے گھر رہنے لگے۔ اس وقت ان کی عمر پانچ سال کی تھی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اُن کی پرورش و پرداخت اور انھیں پروان چڑھانے میں حضرت خدیجہؓ کا ہاتھ نہیں رہا ہوگا۔

حضرت خدیجہؓ، حضورؐ سے اس درجہ محبت کرتی تھیں کہ خادموں کے ہونے کے باوجود حضورؐ کی خود خدمت کرتیں۔ نزولِ وحی سے پہلے جب حضورؐ غارِ حرا میں گوشہ نشین ہوکر خدا کی یاد میں مصروف رہنے لگے تھے، اس وقت حضرت خدیجہؓ ضرورت کا سامان خود لے جا کر دے آتی تھیں۔ حالاں کہ غارِ حرا ان کے مکان سے تین میل کی دوری پر تھا۔

حضرت خدیجہؓ سے عقد ہوجانے کے پندرہ برس بعد اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو منصبِ نبوت سے سرفراز فرمایا۔ غارِ حرا میں جب پہلی بار آپؐ پر وحی کا نزول ہوا اور جبریل نے آپ کو نبی ہونے کی بشارت دی تو نبوت کی اہم ذمہ داریوں کے احساس

سے آپ کے قلبِ مبارک پر ایک طرح کا لرزہ طاری ہوگیا۔ آپؐ وہاں سے گھر تشریف لائے۔ آتے ہی لیٹ گئے اور حضرت خدیجہؓ سے فرمایا "مجھے کپڑا اوڑھا دو۔" اس کے بعد حضور اکرمؐ نے حضرت خدیجہؓ سے وحی نازل ہونے کا واقعہ بیان کیا اور راہ نبوت کے خطرات کا ذکر کیا۔ آپؐ کو اندیشہ تھا کہ لوگ آپ کی بات پر یقین نہیں کریں گے۔

اگر کوئی دوسری عورت ہوتی تو جبریلؑ کے آنے اور وحی نازل ہونے کا انوکھا ماجرا سن کر گھبرا جاتی یا معاملہ ہی اس کی سمجھ میں نہ آتا لیکن حضرت خدیجہؓ جیسے پہلے سے یقین کیے بیٹھی تھیں کہ جو ہستی انسانیت کا مکمل نمونہ ہے، اُسے اللہ کا رسول ہونا ہی چاہیے۔ وہ نہ تو گھبرائیں اور نہ اُن کے دل میں کسی قسم کا وسوسہ پیدا ہوا۔ وہ معاملے کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ گئیں۔

انھوں نے آپؐ کو تسلّی دی۔ آپ کی صلہ رحمی، صداقت، دیانت، خوش معاملگی، غربانوازی، یتیم پروری اور دیگر خوبیوں کو سراہتے ہوئے کہا "نہیں، ہرگز نہیں، خدا آپؐ کو رُسوا نہ کرے گا۔ آپ قرابت داروں کا حق ادا کرتے ہیں، لوگوں کے بوجھ کو اُٹھاتے ہیں، فقیروں اور مسکینوں کی امداد فرماتے ہیں، مسافروں کو مہمان رکھتے ہیں اور انصاف وحق کی خاطر مظلوموں کے کام آتے ہیں۔ خدا آپؐ کا ساتھ ہرگز نہ چھوڑے گا۔"

حضرت خدیجہؓ ایک حوصلہ مند، جفاکش، مستقل مزاج، وفاشعار اور محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ ان کی شخصیت اُس وقت اور بھی زیادہ دلکش اور قدآور نظر آتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے رسول اکرمؐ کی رِسالت کی اس وقت تصدیق کی جب ایک زمانہ آپؐ کا مخالف تھا اور اِس زمانے میں اپنا سارا مال و زر آپؐ پر نچھاور کر دیا جب آپؐ کو اس کی ضرورت تھی۔ اس طرح انھوں نے ازدواجی زندگی کے فرائض کی ادائیگی کا وہ چراغ روشن کر دیا جو آج بھی ہماری راہوں کو منوّر کر رہا ہے۔

معانی و اشارات

اُمّ المومنین — مومنوں کی ماں۔ اُم المومنین کا لقب ہے۔ [illegible] مطلب ہے [illegible]۔
اُم کی جمع اُمہات۔ مومنین جمع ہے مومن کی۔ [illegible]
عقیدت اور احترام سے اُمہات المومنین یعنی مومنوں کی مائیں کہا جاتا ہے۔

فریقین — دونوں حصے دار، دونوں پارٹیاں

صلہ رحمی — رحم دلی سے پیش آنا

دیانت داری — ایمان داری

عقد (عق د) — نکاح

عالی ظرف — بڑے حوصلے والا، صبر و تحمل والا

اَطوار — طور کی جمع، چال چلن، رہن سہن

اَخلاقِ حَسنہ — اچھے اخلاق

تأمّل — (ت اَم مُ لُ) پس و پیش، جھجک

پرداخت — پرورش، نگہبانی

منصبِ نبوّت سے سرفراز فرمایا — نبوت کا درجہ عطا کیا، نبی بنایا

توفیق — غیبی ہدایت

آسایش — آرام

کِفالت — پالنے پوسنے کی ذمہ داری

وحی — پیغامِ الٰہی

نزول — (وحی کا) اُترنا

بشارت — خوش خبری

اندیشہ - ڈر، خطرہ

خوش معاملگی - لوگوں سے برتاؤ اور معاملات میں سلیقہ مند اور صاف ہونا

محاورات:

رنگ میں رنگ جانا - پوری طرح متاثر ہو کر ہو بہو عمل کرنا

قدموں میں ڈال دینا - اختیار میں دے دینا، حوالے کرنا

گوشہ نشیں ہونا - سب سے الگ تھلگ ہو کر تنہائی میں بیٹھنا

مشق و مطالعہ

(الف) ایک یا دو جملوں میں جواب دیجیے۔

۱- رسولؐ اللہ نے تجارت کا تجربہ کس کے ساتھ رہ کر حاصل کیا؟

۲- حضرت خدیجہؓ نے آپ کے ساتھ کسے روانہ کیا؟

۳- رسولؐ اللہ نے حضرت علیؓ کو کفالت میں لینے کے لیے کیوں کہا؟

۴- حضرت خدیجہؓ کی کفالت میں آنے کے وقت حضرت علیؓ کی عمر کیا تھی؟

۵- حضرت خدیجہؓ کے مکان اور غارِ حرا کے درمیان کتنا فاصلہ تھا؟

۶- نبوت ملنے کے وقت حضرت محمدؐ کی عمر کیا تھی؟

(ب) مفصل جواب دیجیے۔

۱- حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی زندگی کے ابتدائی حالات بیان کیجیے۔

۲- حضرت خدیجہؓ نے حضور پاکؐ سے اپنی تجارت میں شرکت کی پیش کش کیوں کی؟

۳- حضرت خدیجہؓ سے حضور پاکؐ کے نکاح کا واقعہ بیان کیجیے۔

۴- حضرت خدیجہؓ اور رسولؐ کی ازدواجی زندگی کیسی تھی؟

۵- حضرت علیؓ کی پرورش میں حضرت خدیجہؓ کا کیا حصہ تھا؟

۶- جب آپؐ کو نبوت ملی تو حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کا کس طرح ساتھ دیا؟

۷- حضرت خدیجہؓ کے اوصاف بیان کیجیے۔

(ج) سیاق وسباق کے حوالے سے تشریح کیجیے۔

۱۔ اب جو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو حضورؐ کو اخلاق حسنہ کے اس بلند مقام پر پایا جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ انھوں نے رسولِ اکرمؐ کی رسالت کی اس وقت تصدیق کی جب ایک زمانہ آپ کا مخالف تھا۔

۳۔ آپ میرے شریکِ کار ہو جائیں۔

۴۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی پرورش و پرداخت اور انھیں پروان چڑھانے میں حضرت خدیجہؓ کا ہاتھ نہیں رہا ہوگا۔

۵۔ نہیں، ہرگز نہیں، خدا آپ کو رسوا نہ کرے گا۔

(د) مندرجۂ ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کے معنی واضح ہو جائیں۔

۱۔ فریقین	۲۔ دیانت داری	۳۔ عالی ظرف
۴۔ کفالت	۵۔ قرابت دار	۶۔ منوّر

• زبان کا مطالعہ:

* مندرجۂ ذیل جملے پر غور کیجیے:

انھوں نے رسولِ اکرمؐ کی رسالت کی اس وقت تصدیق کی جب ایک زمانہ آپؐ کا مخالف تھا اور اس زمانے میں اپنا سارا مال و زر آپؐ پر نچھاور کر دیا جب آپؐ کو اس کی ضرورت تھی۔

اس جملے میں لفظ 'زمانہ' دو مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک 'تمام لوگ یا ساری دنیا' کے معنی میں اور دوسرے 'وقت یا دَور' کے معنی میں۔ اس جملے کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ چند لفظوں کو اس میں دہرایا گیا ہے جس سے بات کی اہمیت واضح ہوتی جاتی ہے، تحریر میں زور اور جوش کا احساس ہوتا ہے اور جملہ طویل ہونے کے باوجود طبیعت پر بار نہیں ہوتا۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس جملے میں کن لفظوں کی تکرار کی گئی ہے؟

●●●

ولادت: ۱۸۳۷ء وفات: ۱۹۱۴ء

مولانا الطاف حسین حالؔی پانی پت میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام ایزد بخش تھا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت پانی پت میں ہوئی لیکن سترہ اٹھارہ برس کی عمر سے وہ دہلی میں رہنے لگے۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے بیٹے کی تعلیم کے لیے مولانا حالؔی کو مامور کیا گیا۔ شیفتؔہ ایک صاحبِ علم اور پختہ مشق شاعر تھے۔ اس زمانے میں حالؔی اپنے اشعار پر شیفتؔہ سے اصلاح لیتے رہے۔ شیفتؔہ ہی کے ساتھ ان کو مرزا غالبؔ کی خدمت میں بھی حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ غالبؔ نے حالؔی کی طبیعت کا اندازہ کر کے کہا "اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر ظلم کروگے۔" چناں چہ حالؔی غالبؔ کے شاگرد ہو گئے۔

مولانا حالؔی کو نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ نثر میں ان کی کتابیں حیاتِ سعدؔی، یادگارِ غالبؔ، حیاتِ جاوید (سوانح عمریاں)، مقدمۂ شعر و شاعری (تنقید) اور مضامینِ حالؔی ہیں۔

حالؔی کو جدید اردو تنقید کا باوا آدم بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی کتاب 'مقدمۂ شعر و شاعری' نے اردو شاعری کو ایک نئی سمت اور نئے موضوعات سے آشنا کیا۔ آج بھی ان کے خیالات کے اثرات اردو شاعری پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

ذیل کا مضمون ان کی کتاب 'مضامینِ حالؔی' سے لیا گیا ہے۔ یہ ایک انشائیہ ہے جس میں انھوں نے طویل خود کلامی کے انداز میں زبان کے استعمال اور اس کے بدلے میں ملنے والی نیک نامی و بدنامی اور عزت و ذلّت اور کامیابی و ناکامی کا ذکر بڑے دل نشیں انداز میں کیا ہے اور یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کی زبان اس کا ایک بہترین ہتھیار ہے جس سے وہ دنیا کو تسخیر کرسکتا ہے لیکن اسے اس ہتھیار کو جو

[illegible]

[illegible]

اے میری بلبل ہزار داستان! اے میری طوطی شیوا بیان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! بھلا تو ہی بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھول میں نرالی مہک ہے۔ کبھی تو ایک ساحرِ افسوں ساز ہے جس کے سحر کا نہ جادو کا اُتار۔ کبھی تو ایک افعیِ جانستاں ہے جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔

اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک ادنا کھیل ہے جس کے تماشے سینکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔

اے میری بنی بات کو بگاڑنے والی! اے میرے بگڑے کاموں کو سنوارنے والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رُلانا، روٹھے کو منانا اور بگڑے کو منانا، نہیں معلوم تو نے کہاں سے سیکھا؟ اور کس سے سیکھا؟ کہیں تیری باتیں بس کی گانٹھیں ہیں اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل۔ کہیں زہر ہے اور کہیں تریاق۔

اے زبان! ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں، ہمارے سیکڑوں نقصان اور ہزاروں فایدے، ہماری عزت، ہماری ذلت، ہماری نیک نامی، ہماری بدنامی، ہمارا سچ، ہمارا جھوٹ صرف تیری ایک 'ہاں' اور ایک 'نہیں' پر موقوف ہے۔ تیری اس 'ہاں' اور 'نہیں' نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں سر کٹوائے۔

اے زبان! تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوا کچھ نہیں مگر تیری طاقت نمونۂ قدرتِ الٰہی ہے۔ دیکھ! اس طاقت کو رایگاں نہ سمجھ اور اس قدرت کو نمائش نہ [illegible]ط۔ راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور کو زنگ نہ لگا۔ تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر اور روح کے پیغام پر حاشیے نہ چڑھا۔ اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز ہے۔ کہیں تیرا خطاب کاشفِ اَسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرمِ اسرار ہے۔ علم کہ ایک خزانۂ غیبی ہے اور دل اس کا خزانچی، حوصلہ اس کا قفل ہے اور تو اس کی کنجی۔ دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانے کو بے موقع نہ اُٹھا۔

وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصحِ مشفق تیری صفت ہے اور مرشدِ برحق تیرا نام۔ خبردار، اس نام کو عیب نہ لگانا اور اس فرض سے جی نہ چرانا۔ ورنہ یہ منصبِ عالی تجھ سے چھن جائے گا اور تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چیتھڑا رہ جائے گا۔ کیا تجھ کو یہ امید ہے کہ تو جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی اٹھائے، تو غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے، تو فریب بھی کرے اور چغلیاں بھی کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے؟

نہیں! ہرگز نہیں!! اگر تو سچی زبان ہے تو زبان ہے ورنہ زبوں ہے۔ بلکہ سراسر زیاں ہے۔ اگر تیرا قول صادق ہے تو شہدِ فائق ہے ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منہ میں اور دوسروں کے دلوں میں جگہ پائے گی ورنہ گُدّی سے کھینچ کر نکالی جائے گی۔

اے زبان! جنھوں نے تیرا کہنا مانا اور جو تیرا حکم بجا لائے انھوں نے سخت الزام اُٹھائے اور بہت پچھتائے۔ کسی نے انھیں فریبی اور مکّار کہا، کسی نے گستاخ اور منہ پھٹ ان کا نام رکھا۔ کسی نے ریاکار ٹھہرایا اور کسی نے سخن ساز۔ کسی نے بدعہد بتایا اور کسی نے

غمّاز۔ غیبت اور بہتان، مکر اور افترا، طعن اور تشنیع، گالی اور دشنام، پھکڑ اور ضلع جگت اور پھبتی۔ غرض دنیا کے عیب ان میں نکالے اور وہ ان سب کے سزاوار ٹھہرے۔

اے زبان یاد رکھ! ہم تیرا کہنا نہ مانیں گے اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئیں گے۔ ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑیں گے اور تجھے مُطلق العنان نہ بنائیں گے۔ ہم اپنی جان پر کھیلیں گے پر جھوٹ نہ بولیں گے۔

الٰہی! اگر ہم کو رخصتِ گفتار ہے تو زبانِ راست گفتار دے اور اگر دل پر تجھ کو اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بن کر آئیں۔ آمین!

معانی و اشارات

طوطی	-	ایک چہکنے والا پرندہ
شیوا بیان	-	فصیح و بلیغ
ساحر	-	جادوگر
فسوں ساز	-	جادو کرنے والا (فسوں- جادو)
رد	-	توڑ، اثر ختم کرنے کا عمل
اُتار	-	اثر ختم کرنے والی دوا
افعی	-	سانپ
جاں گداز	-	جان لیوا
دارو	-	دوا
کاٹے کا منتر	-	سانپ یا بچھو کا زہر اُتارنے کا منتر
سینہ فگار کرنا	-	دل زخمی کرنا، دُکھی کرنا

بس کی گانٹھ	-	زہر کی گانٹھ (بس دراصل وِش ہے یعنی زہر اور گانٹھ یعنی جڑ جیسے ہلدی کی گانٹھ)
حنظل	-	اندراین کا پھل جو بہت کڑوا ہوتا ہے
تریاق	-	زہر کا علاج، افیون کو بھی بولتے ہیں
پارۂ گوشت	-	گوشت کا ٹکڑا
رائگاں کھونا	-	برباد کرنا
راستی	-	سچائی، درستی
ایلچی	-	قاصد، پیغام لانے لے جانے والا
امانت میں خیانت کرنا	-	کسی کی رکھی ہوئی چیز میں تصرف یا کمی کرنا، اسے استعمال کرنا
حاشیہ چڑھانا	-	بات کو بڑھا چڑھا کر بتانا، اپنی طرف سے جوڑنا
کاشفِ اَسرار	-	رازوں کو کھولنے والا
محرمِ راز	-	راز جاننے والا، ہم راز
بے موقع اٹھانا	-	بے ضرورت خرچ کرنا، ضایع کرنا
تلقین وارشاد	-	نصیحت اور ہدایت
بِساط	-	اختیار، حیثیت
طوفان اُٹھانا	-	جھوٹے الزام لگانا
تہمت	-	الزام
زبوں	-	خراب
زیاں	-	نقصان
شہدِ فائق	-	اعلا درجے کا شہد
گُدّی	-	زبان کی جڑ، حلق

منہ پھٹ — بولنے میں گستاخ، بے مروت

سخن ساز — باتیں بنانے والا

غمّاز — چغل خور

مکر اور افترا — فریب اور تہمت

تشنیع — طعنہ دینا، برا بھلا کہنا

دشنام — گالی گلوچ

پھکڑ — ہلکے درجے کا مذاق

ضلع جگت — دو معنی والا لفظ

پھبتی — کسی کا مذاق اُڑانے کے لیے استعمال ہونے والا فقرہ یا لفظ جیسے ہاتھی کا بچہ یعنی بہت موٹا

مُطلق العنان — من مانی کرنے والا جسے کوئی روک نہ سکے، مرضی کا مالک

ظاہر و باطن — اندر اور باہر

رخصت گفتار — بات کرنے کی اجازت (رخصت - اجازت)

راست گفتار — حق گو، سچ بولنے والا

مشق و مطالعہ

(الف) ایک یا دو جملوں میں جواب دیجیے۔

۱- بچوں کی زبان کا بڑوں پر کیا اثر پڑتا ہے؟

۲- زبان کا ایک ادنا سا کھیل کون سا ہے؟

۳- زبان کی ایک 'ہاں' اور 'نہیں' سے کیا ہوتا ہے؟

۴- زبان کا اصل زیور کیا ہے؟

۵- علم کا خزانچی کون ہے؟

(ب) مفصل جواب دیجیے۔

۱- مصنف نے زبان کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لیے کون کون سی مثالیں پیش کی ہیں؟
۲- زبان ہمارے لیے کب نقصان دہ ثابت ہوتی ہے؟
۳- ہماری زبان کب ہمارے لیے وبالِ جان بن جاتی ہے؟
۴- زبان کے شر سے بچنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟
۵- دنیا ہماری زبان سے جنت بھی ہے اور جہنم بھی، کیسے؟

(ج) ذیل کی عبارت کی تشریح کیجیے۔

۱- بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دُکھاتی تھی۔
۲- دل کی امانت میں خیانت نہ کر اور روح کے پیغام پر حاشیے نہ چڑھا۔
۳- وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔

(د) مندرجۂ ذیل الفاظ یا محاوروں کو اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کے معنی واضح ہو جائیں۔

حاشیہ چڑھانا۔ طوفان اُٹھانا۔ عیب لگانا۔
خاک میں ملانا۔ جان پر کھیلنا۔ بس کی گانٹھ۔

• **زبان کا مطالعہ:** آپ دیکھیں گے کہ حالی نے اس انشائیے میں جگہ جگہ ہم وزن الفاظ یا قافیے استعمال کر کے زبان کا لطف پیدا کیا ہے۔ مثلاً 'غیروں کا جی لبھاتی تھی، ماں باپ کا دل دکھاتی تھی' یا "تیرا قول صادق ہے تو شہدِ فائق ہے ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔"

ایسے جملوں کو مسجّع اور مقفّا جملے کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ ان میں سجع اور قافیہ کا استعمال ہوتا ہے۔ آپ بھی ایسے جملے لکھنے کی کوشش کریں اور اپنے استاد سے اصلاح لیں۔

نوٹ: اردو میں لائق و فائق (ہمزہ کے نیچے زیر) کو لایِق و فایِق (ے کے اوپر زبر) بولتے ہیں لیکن حالی کے جملے میں صادِق کے قافیوں کی رعایت سے انھیں عربی کی طرح (فاعِل کے وزن پر) لائِق اور فائِق پڑھنا ہوگا۔

جب میں چھوٹا بچہ تھا

راجندر سنگھ بیدی

ولادت: ۱۹۱۵ء وفات: ۱۹۸۴ء

راجندر سنگھ بیدی اردو کے نام ور افسانہ نگار ہیں۔ اُن کا آبائی وطن پنجاب ہے لیکن زندگی کا بیشتر حصہ ممبئی میں گزرا۔ انھوں نے متعدد افسانے اور ایک ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' لکھا ہے۔ 'دانہ و دام' 'کوکھ جلی' 'گرہن' 'ہاتھ ہمارے قلم ہوئے' ان کے مشہور افسانوی مجموعے ہیں۔ وہ مکالمہ نگار اور ہدایت کار کی حیثیت سے فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔ وہ ترقی پسندانہ نظریات کے حامل تھے مگر ادب میں اُن کا رویہ بے لچک نہیں تھا۔

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں انسانی نفسیات کی خوب صورت تصویریں ملتی ہیں۔ ان کے ہاں انسان دوستی اور دردمندی پائی جاتی ہے۔ وہ بچوں، عورتوں اور بوڑھوں سے خاص طور پر ہمدردی رکھتے ہیں۔ ان کا اندازِ بیان سلجھا ہوا ہے اور جذبات نگاری میں ایک توازن پایا جاتا ہے۔

ذیل کا سبق بیدی کا ایک افسانہ ہے جس میں انھوں نے ایک بزرگ کی اخلاقی عظمت کو پیش کیا ہے جو بچے کو نفسیاتی کش مکش سے چھڑانے کے لیے اپنے بچپن میں کی ہوئی چوری کو جو اب تک سب سے چھپی ہوئی تھی، قبول کر لیتے ہیں۔

***

میرے خیال میں بہت سے ماں باپ اپنے بچوں کو اس قسم کی کہانیاں سنایا کرتے ہیں.... 'جب میں چھوٹا تھا یا چھوٹی تھی۔' انجام کار یہی ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگ بچپن ہی سے مستقل مزاجی اور راست بازی کے پتلے تھے۔ اُنھوں نے شرم و حیا، ادب و تمیز کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ کبھی جھوٹ نہیں بولے اور اپنے بزرگوں کے سامنے

گستاخی سے پیش نہیں آئے اور بمصداق ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، ان کی اخلاقی
عظمت ان کے بچپنے کی ہر حرکت سے مترشح تھی۔

اس قسم کی باتیں سن کر میرا بھی جی چاہتا کہ میں بھی انہی کے مانند نیک انسان
بن جاؤں۔ یہی میرا مطمحِ نظر تھا۔ مجھے اپنے والد ایک بہت بڑی شخصیت دِکھائی دیتے
تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ایک عظیم طاقت تھے جس سے ضلع کا بڑے سے بڑا حاکم
بھی منکر نہیں ہوسکتا تھا۔ جہاں گیرآباد کے سب آدمی اُن کے آگے تعظیماً سر جھکا دیتے
تھے اور ’دیوان بہادر‘ کے سوا انھیں کسی اور لقب سے یاد نہیں کرتے تھے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے میرے والد نے خود ہی ایک عام پدرانہ سی پُرشفقت روش
اختیار کررکھی تھی۔ کسی چھوٹے کے نزدیک آنے پر اُن کا دایاں ہاتھ خودبخود آشیرواد کے
لیے اُٹھ جاتا تھا۔

اُن کے بچپنے کی ایک کہانی ہم سب بچوں کو بہت مرغوب تھی۔ ہم بہت سے بچے
ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ’پرتھوی بَل‘ کے کُھلے صحن میں بیٹھ جاتے اور اپنے بزرگ کی
ایک ہی کہانی، ان کی زندگی کا اہم ترین واقعہ بار بار دہراتے۔

ہم سب کو بابا یعنی میرے والد کی کہانی اچھی طرح یاد تھی۔ اسکول کے پہاڑوں
کی طرح ازبر اور باسی روٹی کی طرح مرغوب۔ اگر میں اس کہانی کا ایک لفظ بھی بدل دیتا
تو باقی بچوں کے نزدیک ایک بڑے جرم کا مرتکب گردانا جاتا۔ اس وقت میرے چچیرے،
پھپھیرے بھائی اور بہنیں فی الفور احتجاج میں اُٹھ کھڑی ہوتیں۔ وہ کہانی چوہوں کے
متعلق تھی اور ایک طرح سے ہمارا خاندانی ’ساگا‘ بن چکی تھی۔

کہانی یوں تھی.....

"جب بابا اور چچا دیوا چھوٹے تھے تو ان کے دل میں چوہے پکڑنے کا خیال پیدا
ہوا۔ اِس بڑے سے، دیوصورت ’پرتھوی بَل‘ کی جگہ اُن دنوں ایک چھوٹا سا خستہ حال

مکان ہوا کرتا تھا جس میں چوہوں کے بڑے بڑے بل تھے۔ چوہے ہر روز پنیر کی ٹکیا ہماری مرغوب باسی روٹیاں اُٹھا کر لے جاتے۔ چچا دیوا نے ایک پنجرہ لگایا، سب چوہے پھنس گئے لیکن ایک چوہا بھاگ کر سرنگ میں گھس گیا۔ وہ سرنگ ایک بڑا لمبا چوڑا بل تھا جس میں سے گزر کر چوہے ذخیرے تک جاتے اور ذخیرے سے واپس اپنے مکان میں آجاتے تھے۔

بابا نے ایک پنجرے کو سرنگ کے منہ پر رکھ کر اسے شہتوت اور پیستون اور سوکھے ہوئے توریے کے گودے اور بیئے کے گھونسلوں سے ڈھک دیا۔ اگلی صبح چچا دیوا کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ وہ پنجرے تک چلے جائیں اس لیے بابا اکیلے ہی گئے (دہراتے ہوئے) اکیلے!

بابا اس وقت ایک چھو..... ٹے سے لڑکے تھے۔ انھوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پنجرے پر سے پتے ہٹائے تو کیا دیکھتے ہیں..... وہاں ایک چوہا تھا..... پورے قد کا۔

بابا اتنے گھبرائے، اتنے گھبرائے کہ جوتوں سمیت دوڑتے ہوئے چوکے میں چلے گئے (ہمارے لیے کہانی کا یہ حصہ سب سے زیادہ سنسنی پیدا کرنے والا تھا..... 'جوتوں سمیت دوڑتے ہوئے چوکے میں چلے گئے!')

وہ بھاگ کر آئے اور چچا دیوا کو آواز دی۔

پھر بابا اور چچا دیوا مل کر سرنگ تک چلے گئے۔ ان کے ہاتھ میں شہتوت کے دو بڑے بڑے موگر تھے، بابا نے چوہے کو مار دیا، بالکل مار دیا اور اُس کی کھال کھینچ کر اسے چھت پر رکھ دیا۔ جب کھال سوکھ گئی تو انھوں نے اُس کھال کو کسی اور کے ہاں بھیجا۔ اس نے کسی اور کے..... اور ایک آدمی نے اس کی فر بنائی۔ آج کل بڑی بھابھی کے سویٹر کو وہی فر لگی ہے۔"

اب معاملہ برداشت کی حد سے تجاوز کر جاتا۔ سب بچے "جھوٹ، جھوٹ،

بکواس، بالکل بکواس" کا شور بپا کر دیتے۔ یہ ممکن نہیں، کہ موٹی جرنیل بھابھی خوب صورت سویٹزر کو ایک ذلیل چوہے کی فرنگی ہو!

ہمارے اخلاق کو بہتر بنانے کے لیے بابا نے ایک استاد رکھ دیا جو سوائے ہمارے باقی سب کی تعظیم کیا کرتا تھا۔ محترم استاد نے حصولِ مقصد کے لیے ایک انوکھا طریقہ ایجاد کیا۔ ہم میں سے سب سے زیادہ متابعت کرنے والے لڑکے کو 'باادب، باتمیز' سرخ نشان دے دیا جاتا تھا۔ پہلے پہل ہم اس جدت کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے لیکن جلد ہی اس جدت کا اثر جاتا رہا اور ہم اس قسم کا اعزاز پانے والے لڑکے کو بڑے رشک وحسد کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ کبھی کبھی ہم 'باادب، باتمیز' کے الفاظ میں سے ادب اور تمیز کے دو لفظوں کو علاحدہ کر کے ایک بکری کے بچے کی طرح 'با..... با' ممیانے لگتے۔

میں اس بات کا معترف ہوں کہ اس قسم کی حرکت میں انگور کھٹے ہیں کا جذبہ کارفرما ہوتا تھا۔ ایک شام کو مجھے بھی وہ اعزازی امتیاز دیا گیا۔ مجھے اس وقت اپنے ہم جولیوں کا ممیانا اور مجھ پر ایک نوع کی غداری کا الزام لگانا بہت برا لگا۔

اُستاد کی تربیت نے مجھے آہستہ آہستہ ذہین، باادب اور باتمیز بنا دیا۔ میرے بزرگ بہت خوش تھے کہ میں اور بچوں کی طرح گستاخ نہیں تھا۔ بہت کم پیسے مانگتا تھا۔ ایک دن میں نے دیکھا دیوان خانے میں صندل کی صندوقچی کے پاس جو قلم دان رکھا تھا، اس پر چند آنے پڑے تھے۔ میں ایک لیمپ کو جلا کر اس کی مدھم مدھم روشنی میں کتاب پڑھ رہا تھا لیکن میرا دل اور میری قوتِ سامعہ شہتوت اور پیستوں کے پتوں میں سے گزرتی ہوئی ہوا کی سیٹیاں سن رہے تھے۔ میرا منہ بڑے بڑے لمبے شہتوت کھا رہا تھا اور میرے ہاتھ پانو کشتی کے چپوؤں کی طرح حرکت کر رہے تھے۔

'پرتھوی پل' کے باہر کوئی جہانگیر آباد کے مشہور چیکو بیچ رہا تھا۔ میں نے سرخ نشان کو دیکھا، اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے قلم دان پر سے پیسے اُٹھا لیے۔

شام کو مجھے بخار ہو گیا۔ ضمیر مجھے برابر سرزنش کرتا رہا۔ میری نبض تیز ہو گئی۔ شام کو بابا آئے۔ اُن کی سفید داڑھی مجھے بہت اچھی معلوم ہوئی۔ میں نے انھیں بتایا کہ "اماں نے مجھے چوری کے الزام میں پیٹا ہے۔ حالاں کہ میں نے چوری نہیں کی۔"

معاً مجھے یاد آیا کہ بابا نے بھی اپنی زندگی میں ایک چوری کی تھی لیکن انھوں نے چوری کا اقبال دادی ماں کے سامنے کرلیا تھا اور آج اماں قلم دان کے پیسوں کے متعلق پوچھتی رہیں لیکن میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ کاش! میں اپنے بابا کی طرح کشادہ دل ہوتا اور اس حرکت کا اعتراف کرلیتا۔

میرے سر میں سخت درد ہو رہا تھا۔ مجھے یوں معلوم ہوا گویا ایک پدرانہ، پُرشفقت ہاتھ میرے سر کی تمام گرمی کو کھینچ رہا ہے۔ بابا میرے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے کہا "بابا..... آپ کہانی سنائیں۔"

"کیسی کہانی؟"

"جب آپ چھوٹے تھے۔ آپ نے ایک دفعہ چوری کی تھی۔ آپ نے اپنی ماں کے سامنے اس بات کا اعتراف کرلیا تھا..... جب آپ چھوٹے تھے....."

بابا میری ماں کو آواز دیتے ہوئے بولے "سیتا! ادھر آنا، ایک پانی کا گلاس لانا... تم نے ننھی کو کیوں پیٹا ہے؟ میں جانتا ہوں وہ کیوں بیمار ہے ....لاؤ پانی، لاؤ گی بھی؟"

پانی کا گلاس لے کر ایک گھونٹ نیچے اُتارتے ہوئے بابا بولے "ہاں، میں نے تمھیں یہ واقعہ سنایا تھا کہ میں نے چوری کی تھی اور اپنی ماں کے سامنے اس بات کا اعتراف کرلیا تھا....."

اس کے بعد بابا نے خاموشی اختیار کرلی۔ اسی وقت جب کہ وہ پدرانہ ہاتھ میری تمام دماغی کش مکش کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا، ان کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ وہ بولے "حقیقت یوں ہے کہ میں نے چوری کی تھی اور سنو ننھی، میرے بیٹے، اُٹھ کر کھیلو.... میں نے آج تک اماں کے سامنے اس چوری کا اعتراف نہیں کیا!"

معانی و اشارات

مستقل مزاجی	-	کسی بات پر قایم رہنے کی عادت
راست بازی	-	ایمان داری، سچائی
گستاخی	-	بے ادبی
ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات	-	ہونہار بچے کی خوبیاں بچپن ہی سے نظر آجاتی ہیں
اخلاقی عظمت	-	اخلاقی بڑائی
مترشح ہونا	-	ٹپکنا، ظاہر ہونا
مطمحِ نظر	-	مقصد، نظریہ
منکر	-	انکار کرنے والا
تعظیماً	-	عزت کے طور پر
لقب	-	وہ نام جو کسی خوبی یا خرابی کے سبب پڑ گیا ہو، خاندانی نام کو بھی لقب کہتے ہیں۔
تقدس مآب	-	بزرگ، پاک
پدرانہ	-	باپ کی طرح، باپ جیسا
شفقت	-	پیار، مہربانی
روش	-	ڈھنگ، عادت
آشیرواد	-	دعائے خیر
رجحانات	-	توجہ
مرغوب	-	پسندیدہ
پرتھوی بل	-	اس عمارت کا نام جس میں رائے بہادر اور ان کا خاندان رہتا تھا

لفظ	معنی
صحن	آنگن
ازبر	زبانی یاد ہونا
مرتکب	قصور وار
فی الفور	فوراً
احتجاج	اعتراض، مخالفت
ساگا	خاندانی روایت، خاندان سے متعلق روایتی کہانی
خستہ حال	بدحال، خراب
سنسنی	سکتے کی حالت
فر	لمبے نرم بالوں والی کھال
تجاوز	حد سے بڑھنا
حصولِ مقصد	مقصد کو حاصل کرنا
متابعت	تابع داری، فرماں برداری
جدت	نیاپن، تازگی
اعزاز	عزت، رتبہ
اعتراف	غلطی یا قصور کو مان لینا
معترف	اعتراف کرنے والا/ اقرار کرنے والا
تجسس	جاننے کی خواہش، کھوج
امتیاز	فرق، تمیز
نوع	قسم
ایک نوع کی غداری	مراد اپنے ہم جولیوں سے الگ ہوجانا
صندوقچی	چھوٹا بکس

قلم دان	-	قلم، دوات اور سب لکھنے کا چھوٹا سا بکس
قوتِ سامعہ	-	سننے کی قوت
ضمیر	-	برائی سے روکنے والی اندرونی قوت
سرزنش	-	برا بھلا کہنا
معاً	-	اچانک
اقبال/ اقبال کرنا	-	قبول کرنا
کشادہ دل	-	حوصلہ مند، بڑے دل والا
اعتراف کرنا	-	مان لینا، قبول کرنا
نم ناک	-	گیلا/ گیلی، تر

مشق و مطالعہ

(الف) ایک یا دو جملوں میں جواب دیجیے۔

۱- اپنے بزرگوں کی باتیں سن کر مصنف کا دل کیا چاہتا تھا؟

۲- مصنف کے والد کا اپنے چھوٹوں کے ساتھ سلوک کیسا تھا؟

۳- گھر میں سب سے مقبول کہانی کون سی تھی؟

۴- دیوان بہادر نے استاد کیوں رکھا تھا؟

۵- بچوں کو کس قسم کا اعزاز دیا جاتا تھا؟

(ب) نیچے دیے گئے سوالوں کے مفصل جواب دیجیے۔

۱- مصنف کے خیال میں ان کے بزرگ اخلاقی طور پر کس طرح عظیم تھے؟

۲- مصنف کی نظر میں ان کے والد کی شخصیت معزز و محترم کیوں تھی؟

۳- بابا کے چوہا پکڑنے کے واقعے کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۴- نندی کو بخار کیوں آیا؟

۵- نندی کے والد نے اپنے بیٹے کے دل کا بوجھ کس طرح کم کیا؟

ج) سیاق و سباق کے حوالے سے جملوں کی وضاحت کیجیے۔

۱- ہم سب کو بابا یعنی میرے والد کی کہانی اچھی طرح یاد تھی۔ اسکول کے پہاڑوں کی طرح ازبر اور باسی روٹی کی طرح مرغوب۔

۲- یہ ممکن نہیں کہ موٹی جرنیل بھابی کے خوب صورت سویٹر کو ایک ذلیل چوہے کی قر لگی ہو۔

۳- میں اس بات کا معترف ہوں کہ اس قسم کی حرکت میں انگور کھٹے ہیں کا جذبہ کارفرما ہوتا تھا۔

۴- میں نے آج تک اماں کے سامنے اس چوری کا اعتراف نہیں کیا۔

) مندرجہ ذیل لفظی ترکیبوں یا محاوروں کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کے معنی واضح ہو جائیں۔

۱- فی الفور	۲- ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات
۳- خستہ حال	۴- وقوع پذیر ہونا
۵- خاطر خواہ	۶- مرغوب ہونا

زبان کا مطالعہ: ذیل کے جملے پر غور کیجیے۔

"اس وقت میرے چچیرے، پھپھیرے بھائی بہنیں فی الفور احتجاج میں اُٹھ کھڑی ہو جاتیں۔"

اس جملے میں 'میرے چچیرے، پھپھیرے بھائی' جنسِ مذکر کے حامل اسم ہیں مگر ان کے ساتھ 'بہنیں' جنسِ مونث کا حامل اسم ہے جو تعداد کے اعتبار سے جمع کا صیغہ ہے۔ اسی لیے جملے میں فعل جمع مونث 'اٹھ کھڑی ہوتیں' لایا گیا ہے۔ یاد رہے جملے میں فعل کی مطابقت اس فاعل کے ساتھ ہوتی ہے جو فعل سے قریب تر ہوتا ہے اور ترتیب میں سب سے اخیر میں آتا ہے۔ جیسے

"کلاس میں بہت سی لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔"

"میز پر کئی گلاس اور ایک رکابی رکھی تھی۔"

"جنگل میں شیر، چیتے، لومڑیاں پائی جاتی ہیں۔"

●●●

وفات: ۱۹۷۰ء

ولادت: ۱۸۷۲ء

گزشتہ پچاس برسوں میں تمام علوم نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔ خصوصاً سائنس میں اتنی تیزی سے ترقی ہوئی ہے کہ جو کام صدیوں میں ہوتا تھا اب مہینوں میں ہو جاتا ہے۔ البتہ مستقبل کی ترقی کی عمارت ہمیشہ ماضی کی کاوشوں کی بنیاد پر تعمیر ہوتی ہے اور ماضی کے دھندلکوں میں جھانکے بغیر مستقبل کے اُجالوں کا مشاہدہ ممکن نہیں۔

زیرِ نظر مضمون مشہور فلسفی برٹرینڈ رسل کی شہرۂ آفاق تصنیف 'سائنسی نقطۂ نگاہ' سے ماخوذ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے بہت سے انتہائی اہم موضوعات پر بحث کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے جہاں گیلیلیو پر عائد ہونے والے الزامات اور بعد ازاں ہونے والے واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے، وہاں سائنسی ترقی کی راہ میں حایل تمام جاہلانہ عقاید اور مزاحمتوں پر بھی مفصل تبصرہ کیا ہے۔ اس مضمون میں اُن کا سائنسی نقطۂ نگاہ بہت نمایاں ہے۔

***

گیلیلیو اور کیپلر دونوں ہم عصر سائنس داں تھے۔ پہلی بار اُنھوں نے ثابت کیا کہ زمین دیگر سیارگان کے ساتھ سورج کے گرد گردش کرتی ہے۔ کوپرنیکس کے علاوہ بعض یونانیوں نے بھی یہ دعوا پیش کیا تھا مگر وہ اپنے حق میں دلائل پیش کرنے سے قاصر رہے تھے۔ کیپلر نے سائنس میں کوپرنیکس کا اِتباع کیا تھا جس نے سب سے پہلے یہ دریافت کیا تھا کہ سیارے سورج کے گرد بیضوی مدار میں حرکت کرتے ہیں۔ گیلیلیو اور کیپلر دونوں کا طریقۂ کار مکمل طور پر سائنسی تھا لیکن ان کے معاصرین کو اُن کے اِن نظریات سے

شدید دھچکا پہنچا کیوں کہ یہ نظریات اُس دور کے عقائد سے متصادم تھے۔ اس زمانے کے مروّجہ عقائد سے گیلیلیو کا تصادم ایک تاریخی حقیقت بن گیا ہے۔

گیلیلیو کے مزاج میں بے باکی اور سختی پائی جاتی تھی۔ کم عمری ہی میں وہ اٹلی کے شہر پیسا میں ریاضی کا پروفیسر بن گیا تھا مگر تنخواہ قلیل ہونے کی وجہ سے اس کے لیے ایک باوقار زندگی گزارنا مشکل تھا۔ وہ اتنا آزاد خیال استاد تھا کہ اس نے کالج میں اساتذہ کے گاؤن اور ٹوپی پہننے کے خلاف ایک کتابچہ لکھا جس سے اساتذہ اس کے مخالف ہو گئے۔ البتہ طلبہ میں وہ مقبول رہا۔

گیلیلیو ایسے مواقع کی تاک میں رہتا تھا جب وہ اپنے ہم چشموں کو کم علم ظاہر کر کے انھیں زیر کر سکے۔ مثلاً ارسطو کے مقلدین اس کے بیان کردہ طبیعیات کے اصول کو مانتے تھے اور دعوا کرتے تھے کہ ایک مقررہ بلندی سے دس پونڈ وزنی جسم، ایک پونڈ وزنی جسم کی بہ نسبت دس گنا کم وقت میں نیچے گرے گا۔ اس دعوے کو غلط ثابت کرنے کے لیے گیلیلیو ایک صبح پیسا کے جھکے ہوئے مینار کی چھت پر جا پہنچا۔ اس کے پاس دس پونڈ اور ایک پونڈ وزن کے دو گولے تھے۔ عین اس وقت جب کہ پروفیسر حضرات اپنے طلبہ کے ہمراہ اپنی جماعت کے کمروں کی طرف بڑھ رہے تھے، اس نے مینار کی چھت سے دونوں گولے ایک ساتھ اُن کے قدموں کے قریب گرا دیے۔ دونوں گولے زمین پر ایک ساتھ گرے لیکن ارسطو کے ماننے والوں نے گیلیلیو کے اس انوکھے تجربے سے متاثر ہونے کے بجائے یہ عذر پیش کیا کہ ان کی آنکھوں کو دھوکا ہوا ہے۔ دراصل وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ ارسطو کا بیان غلط ہو سکتا ہے۔

گیلیلیو کی ایک مشہور ایجاد، اس کی دوربین ہے۔ اس نے پروفیسر حضرات کو دعوت دی کہ وہ اس سے مشتری کے چاند کا مشاہدہ کریں۔ ان حضرات نے دوربین کو چھونے سے بھی انکار کر دیا کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ ارسطو نے مشتری کے سیارچوں کا

ذکر نہیں کیا تھا۔ لہٰذا سیارے دیکھنے والوں کو وہ جھوٹا قرار دیتے تھے۔ دراصل
ہزار سال تک ارسطو کا غیر سائنسی نظریہ ذہن انسانی پر حکمرانی کرتا رہا۔ کسی نے اس
تصدیق بالتجربہ کرنے کی کبھی زحمت گوارا نہ کی۔ "گرتے ہوئے اجسام" کا قانون
کی پہلی اہم دریافت ہے لیکن اس زمانے میں اسے مروّجہ عقیدے سے انحراف اور
سے تعبیر کیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ذہین لوگ اس کے حامی بھی تھے تاہم
یونی ورسٹی کی فضا گیلیلیو کی ان دریافتوں سے نہایت کشیدہ ہوگئی۔

زندگی کے آخری ایام میں گیلیلیو کا مذہبی محاکمہ کیا گیا کیوں کہ اس کا عقیدہ عام
مذہبی عقیدے کے برخلاف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ ۱۶۳۲ء
میں اس نے بطلیموس اور کوپرنیکس کے نظام ہائے فکر پر ایک مکالماتی کتاب لکھی اور اس
کتاب کے ایک کردار سے ایسے جملے کہلوائے گویا وہ پوپ نے ادا کیے تھے۔ اب تک تو
پوپ کا رویہ گیلیلیو کے ساتھ دوستانہ تھا لیکن اس جسارت کے بعد وہ بھی غضب ناک
ہوگیا۔ اس وقت گیلیلیو فلورنس میں بسترِ علالت پر تھا۔ ستّر برس کی عمر میں اس کی بصارت
بھی زائل ہورہی تھی۔ اس کے باوجود مذہبی عدالت نے حکم جاری کیا کہ جوں ہی وہ سفر
کے قابل ہوجائے اسے زنجیروں میں جکڑ کر لایا جائے لیکن گیلیلیو خود عدالت کے روبرو
حاضر ہوگیا۔ عدالت نے جو سزا سنائی وہ سائنسی تحقیق کے خلاف غیر عقلی رویے کی ایک
اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ مذہبی عدالت میں لگائے گئے الزامات کے کچھ خاص
نکات یہ تھے:

۱- یہ قضیہ کہ سورج مرکز کائنات ہے اور اپنی جگہ غیر متحرک ہے، لغو، فلسفیانہ طور پر
غلط اور مذہبی طور پر ملحدانہ ہے۔

۲- یہ قضیہ کہ زمین مرکز کائنات نہیں ہے بلکہ یہ اپنی محوری گردش بھی کرتی ہے، لغو

عدالت کے فیصلے میں کہا گیا:

"اے گیلیلیو! تم سے کفر کا جرم سرزد ہوا ہے چناں چہ تم اُن تمام سزاؤں اور تعزیروں کے حق دار ہو جو اس طرح کے معاملات میں مقدس قوانین روا رکھتے ہیں۔

اے گیلیلیو! ہمیں مسرّت ہوگی کہ تمھیں رہا کر دیا جائے بشرطیکہ تم صدق دل سے اور ایمانِ کامل سے ہماری موجودگی میں اپنے گناہوں اور اپنے کفر پر اظہارِ ندامت کرو۔

اور اے گیلیلیو! تم قسم کھاؤ کہ اب ان عقائد سے تائب ہوگئے ہو کیوں کہ یہ رومن چرچ سے بغاوت کے مترادف ہیں۔"

گیلیلیو نے مجبور ہو کر مذہبی عدالت میں اس طرح کا حلفیہ بیان دیا:

"میں گیلیلیو گیلی لی، انجیل مقدس پر ہاتھ رکھ کر یہ قسم کھاتا ہوں کہ مقدّس گرجے کے تمام ارکانِ ایمان جن کی کہ تعلیم و تبلیغ کی جاتی ہے، درست ہیں۔ مجھے عدالتِ مقدسہ کی طرف سے یہ حکم نامہ ملا ہے کہ میں سورج کو مرکزِ کائنات ہونے اور زمین کے سورج کے گرد گردش کرنے کے نظریے کو ترک کر دوں کیوں کہ یہ مقدس صحیفے کے خلاف ہے۔"

اگرچہ گیلیلیو کو اپنی جان کی حفاظت کے لیے غیر سائنسی نظریات کی تائید کرنی پڑی لیکن آگے چل کر اس کی تحقیق کو ساری دنیا نے تسلیم کرلیا۔ جب آفتابِ عالم تاب طلوع ہوتا ہے تو اس کی ضوفشانی کے آگے ستاروں کی چمک دم توڑ دیتی ہے۔ اسی طرح گیلیلیو کی چند مصدّقہ صداقتوں کی خیرہ کن روشنی نے ازمنۂ وسطیٰ کے لاتعداد عقیدوں کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کو ماند کر دیا۔

گیلیلیو نے حتمی اور یقینی علم کے حصول کے لیے پہلا قدم اُٹھایا تھا اس لحاظ سے اسے عصرِ حاضر کا امام کہا جاتا ہے۔

معانی و اشارات

دلائل	-	دلیل کی جمع
دلیل	-	ثبوت
اتباع	-	پیروی کرنا، تقلید
معاصرین	-	معاصر کی جمع، ہم زمانہ لوگ (عصر - زمانہ)
متصادم	-	ٹکرانے والا (تصادم - ٹکراو)
تاک میں رہنا	-	گھات میں رہنا، موقع کا انتظار کرنا
ہم چشم	-	برابر والا، ہم رتبہ
مقلِدین	-	مقلِد کی جمع، تقلید کرنے والا، پیرو
انحراف	-	پھر جانا، خلاف ہونا
سرکشی	-	بغاوت
محاکمہ	-	فیصلہ کرنے کی کارروائی
جسارت	-	دلیری، بے جا جرأت
قضیہ	-	جھگڑا، بکھیڑا
لغو	-	غلط، بے معنی
مُلحِد	-	بے دین
تنقیص	-	نقص نکالنا
باطل	-	جھوٹ، غلط
تائب	-	توبہ کرنے والا
مترادف ہونا	-	برابر ہونا، ہم معنی ہونا
ضوفشانی	-	روشنی کا پھیلنا یا بکھرنا
نجوم	-	نجم کی جمع، ستارے، سیارے
خیرہ کن	-	آنکھوں کے سامنے اندھیرا پیدا کرنے والا، آنکھیں چُندھیانے والا

مشق و مطالعہ

(الف) مندرجۂ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیجیے۔

۱۔ سورج کے گرد سیاروں کی بیضوی مدار میں گردش کا سب سے پہلے کس نے دریافت کیا؟

۲۔ گیلیلیو کا تقرر کس مضمون کے پروفیسر کی حیثیت سے کہاں ہوا؟

۳۔ ایک باوقار زندگی گزارنا گیلیلیو کے لیے کیوں مشکل تھا؟

۴۔ گیلیلیو کی سب سے مشہور ایجاد کیا ہے؟

۵۔ مذہبی محاکمے کے وقت گیلیلیو کی عمر کیا تھی؟

۶۔ گیلیلیو کو عصر حاضر کا امام کیوں کہا جاتا ہے؟

(ب) مفصل جواب دیجیے۔

۱۔ یونی ورسٹی میں گیلیلیو کو کن لوگوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور اُس کے اسباب کیا تھے؟

۲۔ پیسا کے مینار سے گیلیلیو نے کون سا تجربہ کیا اور کیوں؟

۳۔ سورج اور زمین کے متعلق ارسطو کے نظریات کیا تھے؟

۵۔ کلیسا اور گیلیلیو میں نزاع کا سبب کیا تھا؟

۶۔ مذہبی عدالت سے گیلیلیو کی گلو خلاصی کس طرح ہوئی؟

(ج) مندرجۂ ذیل الفاظ یا محاوروں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

تاک میں رہنا۔ ہم چشم۔ سرکشی۔ جسارت۔ قضیہ۔

(د) ذیل کے جملوں کی تشریح کیجیے۔

۱۔ کیپلر اور گیلیلیو کے نظریات اس دور کے عقائد سے متصادم تھے۔

۲۔ جب آفتابِ عالم تاب طلوع ہوتا ہے تو اس کی ضوفشانی کے آگے ستاروں کی چمک دم توڑ دیتی ہے۔

(ہ) ہندوستانی سائنس داں صدر جمہوریہ اے پی جے عبدالکلام کی سائنسی خدمات پر بیس سطروں کا مضمون لکھیے۔

(و) ہندوستانی سائنس دانوں کی تصویروں کا البم بنائیے۔

●●●

ولادت ۱۹۰۰ء   وفات ۱۹۷۰ء

نام سید امتیاز علی اور تاج تخلص تھا۔ بچپن ہی سے ذہین تھے۔ ابتدائی تعلیم پہلے گھر پر پھر اسکول میں ہوئی۔ انھیں کم عمری سے ہی تھیٹر اور ڈراموں کا شوق تھا۔ ۱۹۲۲ء میں انھوں نے اپنا شاہکار ڈراما 'انارکلی' لکھا جو دس برس بعد ۱۹۳۲ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اس ڈرامے میں ان کی بہترین تخلیقی صلاحیتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ انارکلی کے بعد انھوں نے کوئی مکمل اسٹیج ڈراما نہیں لکھا۔ البتہ یک بابی ڈرامے، ریڈیو ڈرامے، فلمی کہانیاں اور مکالمے لکھتے رہے۔ انھوں نے فلم سازی بھی کی اور فلمی ہدایت کار کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔

سید امتیاز علی تاج کی مزاحیہ کتاب "چچا چھکن کے کارنامے" کو اردو ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ چچا چھکن اردو ادب کا ایک بے مثال مزاحیہ کردار ہے۔ اپنی دل چسپ گفتگو اور مضحکہ خیز حرکات کی وجہ سے چچا چھکن کا شمار زندہ کرداروں میں ہوتا ہے۔

ذیل کے اقتباس میں چچا چھکن ایک خط کا جواب دیتے نظر آتے ہیں۔ ایک معمولی سا رقعہ لکھنے کے لیے وہ جتنا اہتمام کرتے اور جتنا وقت صَرف کرتے ہیں، اسے مصنف نے بڑے دل چسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ چچا کا طرزِ تحریر بھی اب اتنا قدیم اور متروک ہو چکا ہے کہ اس کے پڑھنے اور سمجھنے کے لیے موجودہ دور کے لوگوں کے پاس نہ وقت ہے نہ دماغ۔ امتیاز علی تاج نے اس سبق میں اس پرانے طرزِ تحریر کو بھی مذاق کا نشانہ بنایا ہے۔

ایک بات یاد رہے کہ اس تحریر میں ساٹھ ستر سال پرانی تہذیب اور رہن سہن کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ چناں چہ لکھنے پڑھنے کا سامان بھی پرانے ڈھنگ کا ہے۔ یہاں

فاؤنٹین پین اور بال پائنٹ پین کی جگہ اب ہولڈر، قلم [illegible]
دوات اور جاذب کی ضرورت پڑتی ہے۔ گھر میں کئی نوکر چاکر اور بال بچے معاون
رہتے ہیں۔ منصرم صاحب کا ملازم جواب کے انتظار میں باہر کھڑا رہتا ہے اور اندر
چچا چچی کی نوک جھونک جاری رہتی ہے۔ امتیاز علی تاج کی تحریر سے لطف اندوز ہونے
کے لیے اس پس منظر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

صبح کے وقت چچی دالان میں چارپائی پر بیٹھی بچوں کو چائے پلا رہی تھیں۔ چچا چائے سے فارغ ہوکر صحن میں کرسی پر اکڑوں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ اتنے میں بندو بھاگتا ہوا گیا اور ایک خط لاکر چچی کے قریب رکھ دیا۔ چچا نے دس مرتبہ پوچھ ڈالا "کس کا خط ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کس نے بھیجا ہے؟ کیا بات ہے؟"

چچی بگڑ گئیں "توبہ ہے، خط آیا نہیں اور سوالات کا تانتا باندھ دیا۔ مجھے غیب کا علم تو آتا نہیں کہ دیکھے بغیر بتادوں کس کا خط ہے۔"

چچا کچھ خفیف سے ہوگئے۔ "بھلا صاحب خطا ہوئی کہ پوچھا۔ ہماری بلا سے کسی کا ہو۔"

بندو نے کہا "بیگم صاحب، منصرم صاحب کی بیگم کا آدمی جواب کے انتظار میں کھڑا ہے"۔

یہ سن کر چچا سے نہ بیٹھا گیا۔ پوچھا "کیا لکھا ہے منصرم صاحب کی بیوی نے؟"

چچی نے چائے کی پرچ چھٹن کے منہ سے لگاتے ہوئے بے پروائی سے کہا "رات کے کھانے پر بلایا ہے۔"

"کیا بات ہے؟ کوئی تقریب؟"

چچی نے کسی قدر سرسری انداز میں کہا "بات کیا ہوتی؟ منشی صاحب کی بیوی مجھ سے ملنا چاہتی تھیں، انھیں اور مجھے دونوں کو کھانے پر بلا لیا ہے۔"

شاید مزید اطمینان حاصل کرنے کو چچا بولے "تو گویا زنانہ ضیافت ہے۔ بڑ

معقول بیوی ہیں۔ ایسی ملنسار بیویاں کہاں نظر آتی ہیں۔ ضرور جاؤ ضیافت میں۔ بلکہ کو موقع ہو تو انھیں بھی اپنے ہاں مدعو کرو۔" ساتھ ہی ایک مشورہ بھی فیصلے کی صورت میں پیش کیا "بچے تو جائیں گے ہی ساتھ۔"

چچی نے کچھ بگڑ کر آہستہ سے کہا "ہمسایوں کو بھی نہ لیتی جاؤں۔"

باہر ملازم جواب کا تقاضا کر رہا تھا۔ ایسا موقع اور چچا اپنی خدمات پیش کرنے سے رُک جائیں؟ بولے "ہم لکھ دیں جواب؟"

چچی بولیں "نہ بس آپ معاف رکھیے۔ فارغ ہو کر میں آپ ہی لکھ لوں گی۔"

روکے جانے کا باعث چچا کیوں نہ پوچھیں۔ بولے "کیا معنی؟ ہم خط لکھنا نہیں جانتے؟ دعوت منظور کرنے ہی کا خط لکھنا ہے نا! تو اس کا لکھنا ایسی کون سی جوئے شیر لانا ہے۔"

اتنے میں گھُٹّن نے جلدی سے چائے کا گھونٹ بھرا تو اسے اُچھال آ گیا۔ ساری کی ساری چائے کپڑوں پر آن پڑی۔ چچی "ہائے نامراد" کہتی ہوئی تولیے سے کپڑے پونچھنے لگیں کہ ادھر باہر سے آواز آئی۔

"کیوں صاحب ملے گا جواب؟" چچی نے گھبرا کر چچا سے کہہ دیا "اچھا پھر اب آپ ہی یہ لکھ دو کہ آ جاؤں گی"۔

اب کیا تھا، چچا کو منہ مانگی مراد ملی۔ خط و کتابت کے متعلق ضروری سامان فراہم کیے جانے کے احکام صادر ہونے لگے۔

"بندو، میرے بھائی، ذرا لانا تو خط لکھنے کا سامان جھپاک سے۔ کیا کیا لائے گا بھلا؟ قلم دوات اور کاغذ۔ شاباش! مگر کون سے کاغذ؟ آسمانی رنگ کے بڑھیا، رول دار۔ ہاں دکھانا تو ذرا اپنی چال اور سنیو...... چلا گیا؟ لفافہ بھی چاہیے ہوگا۔ ارے بھئی کوئی لفافہ بھی تو لاؤ۔ تو جا کر لائیو مودے۔ پر نیلے ہی رنگ کا ہو لفافہ۔ صندوقچے میں رکھے

ہیں۔ لکڑی کے صندوقچے میں۔ الماری میں ہوگا صندوقچہ۔ بڑی الماری میں۔ سن لیا نا؟ ذرا پھرتی۔۔۔"

"ارے ہاں اور جاذب بھی تو لانا ہے بھئی۔ جاذب! جاذب! کوئی نہیں سنتا۔ کہاں گیا؟ او امامی! دیکھیں اس بدمعاش کی حرکتیں۔ کسی کام نکلنے کی دیر ہے اور غائب۔ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔ ذرا تم چلے جاتے میاں للو! وہ جو بڑی کاپی ہے نسخوں کی، وہ ہمارے تکیے کے نیچے رکھی ہے۔ اس میں ایک جاذب ہے وہ نکال لانا اور دیکھنا۔ اماں سنو تو۔ بھئی للو! ارے میاں للو! او للو کے بچے! عجب حالت ہے ان لوگوں کی۔ بس ایسے گھبرا جاتے ہیں جیسے ریل ہی تو پکڑنی ہے۔ ودّو! تم جا کر کہو جاذب نہ لائیں کاپی ہی لے آئیں۔ آخر خط بھی تو کسی چیز پر رکھ کر لکھا جائے گا۔ ہاتھ پر رکھ کر تو میں لکھنے سے رہا۔ اور سننا میری بات۔ وہ کہیں ہمارا چشمہ بھی رکھا ہوگا وہ بھی ڈھونڈتے لانا۔"

لیجیے صاحب ایک دومنٹ میں گھر کا گھر مصروف ہوگیا۔ ایک کو کوئی چیز مل گئی، دوسرا خالی ہاتھ چلا آرہا ہے کہ فلاں چیز نہیں ملتی۔ کوئی کہتا ہے "فلاں چیز مقفّل ہے"۔ کنجیوں کا گچھا ڈھونڈا جارہا ہے۔ چچا بگڑ رہے ہیں۔ مونچھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔

خدا خدا کرکے تمام چیزیں جمع ہوئیں۔ چچا نے چشمہ لگایا۔ کرسی پر براجمان ہوئے۔ لڑکے چیزیں لیے اردگرد کھڑے ہوگئے۔ کاغذ سنبھالا، کاپی اس کے نیچے رکھی۔ قلم ہاتھ میں لیا۔ اب دیکھتے ہیں تو اس کا نب ندارد!

"ہیں! نب کہاں ہے؟ لاحول ولاقوۃ اِلّا باللہ! اب اندھے اس سے لکھوں گا خط؟ اس سے لکھنا ہوتا تو میں اپنی اُنگلی سے نہ لکھ لیتا؟ تجھے قلم لانے کو کیوں کہتا؟ میں آج معلوم کرکے رہوں گا یہ حرکت کس نامعقول کی ہے؟"

باہر سے آواز آئی "ابی صاحب جواب کے لیے کھڑے ہیں۔"

چچی یہ سب کیفیت دیکھ رہی تھیں اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھیں
آواز سن کر نہ رہا گیا۔ بولیں "خدا کے لیے لکھنا ہے تو لکھ دو۔ وہ غریب باہر کھڑا
ہے۔ یہ قلم نہیں تو میرا قلم موجود ہے۔ جا بنّو میرا قلم لا دے۔"

چچا اس وقت جوش میں تھے۔ چچی پر بھی برس پڑے۔ "تمھاری ہی وجہ
نوکروں اور بچوں کی عادتیں بگڑ رہی ہیں۔ یہ ضرور ان میں سے کسی کی حرکت ہے
بچہ یا ملازم ہمارے اس قلم سے تفریح کرتا رہا اور اسی نے اس کا نب ضائع کیا
بتاؤ کہ یہ حرکت کس کی ہے؟"

اتنے میں بنّو چچی کا قلم لے آئی۔ چچا کا آخری فقرہ سن کر اس نے ان
ڈالی تو بولی "لال قلم! ابا میاں کل آپ ہی نے تو ازار بند ڈالنے کو اس کا نب
چچا نے گھور کر بنّو کو دیکھا۔ قلم کو دیکھا۔ کچھ سوچا۔ کھنکار کر گلا صاف
پینترا بدلا۔ کنکھیوں سے چچی اماں پر نظر ڈالی اور قلم بنّو کے ہاتھ سے لے
انگوٹھے کے ناخن پر اس کا نب پرکھنے لگے۔ بولے "چلو اب اسی سے کام
آواز کا سُر بہت مدھم تھا۔

خط لکھنا شروع کیا۔ القاب ہی لکھا ہوگا کہ خط کا کاغذ پھاڑ ڈا
ڈوبا لیا لیکن لکھتے لکھتے رُک گئے۔ بہت دیر تک مضمون سوچتے رہے۔
کیا۔ نب اتنی دیر میں خشک ہو چکا تھا۔ آپ سمجھے دوات میں سیاہی
دوات میں ڈال دیا۔ تحریر شروع کرنے کی دیر تھی کہ سیاہی کا یہ بڑ
کہہ کر اس کاغذ کو بھی پھاڑ ڈالا۔ تیسرا کاغذ منگوایا۔ اس پر دو تین
کے بعد قلم روک کر جو کچھ لکھا تھا، پڑھا۔ چچی کی طرف دیکھا،
پھاڑ ڈالا۔ ہلکے سے مودے سے کہا "خط کے کاغذوں کی کاپی ہو

کاغذوں کی کاپی کی کاپی آدھی اور رقعے کا جواب بے قاعدگی سے لکھا جانا شروع ہو گیا۔ کبھی قلم کا شکوہ کہ خط درست نہیں، [illegible] ہے۔ کبھی دوات کی شکایت کہ سیاہی ٹھیک نہیں، پھیکی ہے۔ کبھی جاذب برا کہ یہ جاذب ہے یا چٹکلے بنانے کا کاغذ۔ ہر شکوہ ایک نیا کاغذ ضائع کرنے کی تمہید۔ اسی میں پون گھنٹا ہونے آ گیا۔ باہر ملازم آوازوں پر آوازیں دے رہا ہے۔ ادھر چچی یہ قصہ ختم کرنے کا تقاضا کر رہی ہیں۔ بار بار کہہ رہی ہیں "خدا کے لیے تم مجھے قلم دوات دو میں ابھی دو منٹ میں لکھے دیتی ہوں خط۔" مگر چچا اپنی قابلیت کی یہ توہین کیوں کر برداشت کر لیں۔ سٹ پٹا گئے ہیں مگر خط لکھنے سے باز نہیں آتے۔ پینترے پر پینترا بدل رہے ہیں اور کاغذ پر کاغذ ردی کیے چلے جا رہے ہیں۔

غرض پورے ڈیڑھ گھنٹے میں خط ختم ہوا اور اسے جلدی جلدی بند کر کے چچا نے باہر ملازم کے حوالے کیا۔

لیکن لطف اس وقت آیا جب دوپہر کو منصرم صاحب کی بیوی کے ہاں سے پھر ایک لفافہ آیا جس میں چچا چھکن کا لکھا ہوا خط رکھا تھا اور ساتھ ہی اس مضمون کا ایک رقعہ۔ "پیاری بہن، شاید غلطی سے کسی اور کے نام کا خط میرے نام کے لفافے میں رکھ دیا گیا۔ واپس بھیجتی ہوں۔ براہِ مہربانی ملازم کے ذریعے زبانی اطلاع دیجیے کہ آپ رات کو تشریف لا سکیں گی یا نہیں؟"

چچی نے چچا کا لکھا ہوا خط پڑھا تو اس کی عبارت یہ تھی:

"جمیلُ المناقب، عمیمُ الاحسان زاد عنایتکم۔ یہاں بفضلِ ایزد خیریت ہے اور صحت و تندرستی آپ کی بدرگاہِ مجیب الدّعوات ہمہ الاوقات نیک چاہتے ہیں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ تلطّف نامہ ساعتِ مسعود میں وارد ہوا۔ طمانیتِ کلّی ہو کہ وقتِ معیّن پر حاضری کے شرف و افتخار کا حصول مایۂ ناز متصوّر ہو گا۔"

معانی و اشارات

ڈورا بڑھانا	–	سلسلہ جاری کرنا
محجوب ہونا	–	شرمندہ ہونا
منصرم	–	انتظام کرنے والا
منصرم صاحب	–	منیجر صاحب
پرچ	–	پیالی، چھوٹی تشتری
جوئے شیر لانا	–	مشکل یا تقریباً ناممکن کام انجام دینا (فرہاد نے شیریں کو حاصل کرنے کے لیے پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر لائی تھی۔ یہ محاورہ اُسی قصّے پر مبنی ہے)
منہ مانگی مراد ملنا	–	دلی خواہش یا دلی تمنا کا پورا ہونا
پیچ و تاب کھانا	–	اندر ہی اندر غصّے سے گھٹنا
ڈوبا لینا	–	قلم کو سیاہی میں ڈبونا
توہین	–	بے عزتی، ہتک
جمیلُ المناقِب	–	اچھی صفات والا
عمیم الاحسان	–	عام احسان کرنے والا
زَادَ عِنایتکم	–	آپ کی عنایت زیادہ ہو
بفضلِ ایزد	–	اللہ کے فضل سے
بدرگاہ	–	حضور میں
مُجیب الدّعوات	–	دعائیں قبول کرنے والا مراد اللہ تعالیٰ
خمس الاوقات	–	پانچوں وقت
نیک	–	اچھی، خوب
تلطف نامہ	–	مہربانی نامہ، کرم نامہ
ساعتِ مسعود	–	نیک ساعت یا بابرکت موقع

وارد ہوا	- آپہنچا
طمانیت کلی ہو	- پورا اطمینان رہے کہ
مایۂ ناز	- باعثِ فخر
متصور ہوگا	- تصور کیا جائے گا، سمجھا جائے گا

مشق و مطالعہ

(الف) ایک یا دو جملوں میں جواب دیجیے۔

۱۔ بندو نے چچی کو کیا لاکر دیا؟

۲۔ چچی کو دعوت پر کس نے بلایا تھا؟

۳۔ چھکن کو اچھال کیوں آیا؟

۴۔ چچا چھکن نے کس سے خط لکھنے کا سامان منگوایا؟

۵۔ گھر کے تمام افراد کیوں مصروف ہوگئے؟

۶۔ قلم دیکھ کر چچا چھکن کیوں چراغ پا ہوئے؟

۷۔ ایک خط لکھنے میں چچا چھکن نے کتنا وقت صرف کیا؟

۸۔ منصرم صاحب کی بیوی نے چچا چھکن کا خط کیوں لوٹا دیا؟

(ب) مفصل جواب دیجیے۔

۱۔ چچا چھکن کو خط لکھنے کا موقع کس طرح حاصل ہوا؟

۲۔ خط لکھنے کے لیے چچا چھکن نے کیا کیا لوازمات طلب کیے؟

۳۔ خط لکھنے میں کیوں دیر ہورہی تھی؟

۴۔ چچا چھکن کو خط لکھنے کی اجازت ملنے پر گھر کے افراد پر اس کا کیا اثر ہوا؟

۵۔ چچی چچا چھکن پر کیوں خفا ہورہی تھیں؟

۶۔ اس سبق کے ذریعے چچا چھکن کے کردار کی کن خصوصیتوں کا پتا چلتا ہے؟

۷۔ جب خط مکتوب الیہ تک پہنچا تو اس کا نتیجہ کیا نکلا؟

(ج) متن کے حوالے سے درج ذیل جملوں کی وضاحت کیجیے۔

۱- مجھے لیب کا علم تو آتا نہیں کہ دیکھے بغیر بتا دوں کس کا خط ہے۔

۲- اچھا ہے اب تم ہی لکھ دو کہ آ جاؤں گی۔

۳- چلو اب اسی سے کام چل جائے گا۔

۴- ہر شکوہ ایک نیا کاغذ ضایع کرنے کی تمہید۔

(د) بچا کے بارے میں مصنف کے ان جملوں کی خوبی سیاق وسباق کے لحاظ سے بیان کیجیے

۱- مونچھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

۲- آواز کا سر بہت مدھم تھا۔

(ہ) ذیل کے محاوروں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

تانتا باندھنا۔ خفیف ہونا۔ جوئے شیر لانا۔ منہ مانگی مراد ملنا۔ پیچ و تاب کھانا۔

(و) اپنے دوست یا سہیلی کو خط لکھ کر اس کی سالگرہ کی تقریب میں شریک ہونے کی اطلاع دیں۔

- مفرد جملے: بعض جملوں میں صرف ایک فعل ہوتا ہے اور بعض میں ایک سے زیادہ فعل ہوتے ہیں۔ جس جملے میں ایک فعل ہو اسے 'مفرد جملہ' کہتے ہیں۔

مثلاً * عالیہ سبق یاد کرتی ہے۔

* شاہد قرآن پڑھ رہا ہے۔

* عبداللہ رتنا گری گئے ہیں۔

اسی طرح اس سبق کے مفرد جملے دیکھیے۔

۱- بچا صحن میں کرسی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔

۲- آدمی جواب کے انتظار میں کھڑا ہے۔

●●●

(۲)

گردِ سفر

ملک تاے

ولادت: ۱۹۲۲ء

ملک تاے کا پورا نام ملک احمد تاے ہے۔ وہ مہاراشٹر کے ایک صنعتی شہر بھیونڈی کی ایک بستی نظام پور میں پیدا ہوئے۔ ساتویں جماعت پاس کرنے کے بعد رئیس ہائی اسکول بھیونڈی سے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ اعلا تعلیم کی غرض سے ممبئی پہنچے اور وہاں اسماعیل یوسف کالج سے ایم۔ اے اور گورنمنٹ لا کالج سے وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی میں فیلو مقرر ہوئے۔ کچھ عرصے بعد محکمۂ انکم ٹیکس سے وابستہ ہوگئے۔ اسی ملازمت کے دوران مشرقی افریقہ کے ملک کینیا کی دعوت پر حکومتِ ہند کی جانب سے وہاں گئے اور محکمۂ انکم ٹیکس کے افسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

کینیا میں قیام کے دوران انھیں افریقہ کے بیش تر ممالک اور وہاں کے باشندوں، ان کے رسم و رواج اور ان کی تہذیب و تمدن کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اپنے مشاہدات اور مطالعہ کو انھوں نے 'گردِ سفر' کے نام سے شائع کیا ہے۔ ذیل کا سبق اسی سفرنامے سے ماخوذ ہے جس میں انھوں نے افریقہ، کینیا اور نیروبی کے لوگوں کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کو بیان کیا ہے۔

ملک تاے کو شعر و ادب سے فطری لگاؤ ہے اور طبیعت موزوں، مشاہدہ تیز اور دل درد آشنا رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی فکرِ سخن بھی کرلیا کرتے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ 'درِ نہاں' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

ملک تاے کو مختلف ریاستی اور قومی انعامات و اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔ آج کل وہ ریاست مہاراشٹر کے پونہ شہر میں سکونت پذیر ہیں۔

۱۹۶۰ء تک پورا مشرقی افریقہ برطانوی تاج شاہی کا غلام بن کر رہ گیا تھا۔ پر غلامی کا احساس ہی آزادی کی نیو بھی ڈال دیتا ہے۔ کینیا ۱۹۶۳ء میں برطانیہ سے آزاد ہو گیا۔ کینیا کا سب سے زیادہ خوش نما، گنجان آباد اور سیاسی، سماجی، ثقافتی اور تجارتی مرکز نیروبی ملک کا دارالحکومت بن گیا۔ مشرقی افریقہ کے شہروں میں سلونت ف... افریقیوں میں انگریزوں کی غلامی کے سبب مغرب زدگی کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔ لوگ کافی خوش پوش و خوش ذوق مگر آسائش طلب ہوتے ہیں۔ دفتروں میں کام کرنے والوں کے لیے سوٹ پہننا لازمی ہے۔ سوائے سنیچر کے۔ اس دن ملبوس میں کوئی تکلف نہیں برتا جاتا۔ عام طور پر پتلون اور قمیص پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ عورتیں تو روز ہی فراک زیب تن کیے ہوتی ہیں۔

ہر صاحب حیثیت افریقی کے پاس شاندار کار ہوتی ہے۔ کسی کسی خاندان میں ایک سے زاید کاریں ہوتی ہیں۔ پیسا بے دریغ خرچ کرتے ہیں۔ بچت کو ان کے طرزِ رہائش اور اندازِ فکر میں کوئی جگہ نہیں۔ افریقی قبائل میں ککوی قبیلہ سب پر حاوی ہے۔ ان میں تعلیم یافتہ افراد کا تناسب دوسرے قبائل کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ برسرِ اقتدار حکومت میں انھیں لوگوں کی اکثریت ہے اور بیشتر یہی اعلا عہدوں پر فائز ملتے ہیں۔

افریقیوں کی مقبول و مرغوب غذا 'اگالی' نام کی ایک کھچڑی ہے جو مکئی، گوشت، گوبھی اور دیگر سبزیوں کو ملا کر بنائی جاتی ہے۔ چوں کہ گوبھی اس کا لازمی جز ہے اور اس کے روزمرہ استعمال سے پیٹ کے کینسر کے امکانات میں کافی کمی واقع ہوتی ہے، اس لیے افریقیوں میں اس قسم کے کینسر کی شکایت بہت کم پائی گئی ہے۔

یہاں کی خادمائیں نہایت تربیت یافتہ ہوتی ہیں۔ بغیر بولے ہر کام باقاعدگی اور چابک دستی کے ساتھ کرتی ہیں۔ صبح آتے ہی لباس تبدیل کر کے باہر کھڑی کار کی اندر اور باہر سے اچھی طرح صفائی کر کے جوتوں کی پالش کرتی ہیں۔ پھر غسل خانے اور فرش

کی صفائی میں جٹ جاتی ہیں۔ اس سے فارغ ہو کر دیگر ضروری کاموں کی طرف متوجہ ہوتی ہیں۔ پھر لباس تبدیل کر کے باہر قدم رکھتی ہیں۔ حکومت نے گھریلو خادماؤں اور خادماؤں کی تنخواہیں بھی مقرر کر رکھی ہیں۔

خادماؤں کے سلسلے میں ایک انوکھا تجربہ یاد آتا ہے جو ہمارے ملک کے لیے سبق آموز ہے۔ ہمارے پاس ایک بہت ہی باصلاحیت ملازمہ تھی۔ کچھ عرصے کے بعد اسے کھانسی کی شکایت ہوئی۔ سٹی کونسل کے اسپتال میں تشخیص تپ دق قرار پائی۔ ایک روز ہمیں سٹی کونسل سے ایک خط دستیاب ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ آپ کی ملازمہ کو تپ دق کا عارضہ لاحق ہے اور جب تک ہماری جانب سے اس کی صحت یابی کا مراسلہ نہیں ملتا، اسے کام پر رجوع نہ کریں۔ ہمیں یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ اپنا ڈاکٹری معائنہ کرائیں۔ ہم نے اس ہدایت پر پوری طرح عمل کیا۔ چند مہینوں بعد وہاں سے خط آیا کہ آپ کی ملازمہ روبہ صحت ہوگئی ہے اور آپ اسے کام پر واپس بلا سکتے ہیں۔ یہ سب اس ملک میں پیش آیا جو ہم سے کہیں زیادہ پچھڑا ہوا ہے۔

افریقی قبائل کے کچھ قبائلی مذاہب بھی ہیں مگر ان کی ایک بڑی تعداد نے عیسائیت اور اسلام کو اپنا لیا ہے۔ یہ اُن کی نسل سے ہوں گے جنھوں نے عرب اور عیسائی مبلغین کے زیر اثر ان دو مذہبوں کو اپنایا ہوگا۔ بہرحال شہر میں بسے سبھی قبیلوں کے افراد کی طرزِ معاشرت مغربی انداز کی ہے۔ بعض قبیلوں کے لوگ طبعاً غریب واقع ہوئے ہیں۔

افریقی عموماً ہنس مکھ اور خوش مزاج ہوتے ہیں۔ زور زور سے باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے رہتے ہیں۔ ایک بار ایک افریقی کو دیکھا کہ چوراہے پر بیٹھا ہنس ہنس کر اور مزے لے لے کر گا رہا تھا "ہم کالے ہیں تو کیا ہوا دل والے ہیں۔" لیکن ان میں تجارتی شعور کا بڑا فقدان ہے۔

افریقیوں کو کچھ عرصے پہلے تک کرکٹ سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ عام طور پر فٹ بال،

ہاکی، باکسنگ اور فری اسٹائل کشتیوں سے انھیں دلچسپی تھی۔ البتہ ایشیائی باشندوں کے
لیے کرکٹ میچ پکنک کا دن ہوتا تھا۔ ہم نے اکثر دیکھا کہ شائقین سامانِ خورونوش سے
لدے ہوئے میدان سے لگ کر اپنی کاروں میں بیٹھے کھیل سے لطف اندوز ہو رہے
ہیں۔ قدرتی خوب صورتی کی بدولت درختوں کی قطاروں سے گھرے کھیل کے میدان
کافی دیدہ زیب ہوتے ہیں۔ کھیل کے اچھے مظاہرے کی داد تالیوں سے نہیں کار کے
ہارن بجا کر دی جاتی ہے۔ کبھی کبھار کھلاڑیوں پر پیسوں کی بارش بھی ہوتی ہے۔ اب
کینیا کی ٹیم عالمی مقابلوں میں بھی شرکت کرنے لگی ہے اور اس میں افریقی کھلاڑی
دکھائی دینے لگے ہیں۔

کینیا میں جا کر بسے ہوئے ہندوستانی باشندے وہاں کے ہر شعبۂ تجارت پر بہت
بڑی حد تک حاوی ہیں لیکن مالی ترقی انھیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ کر حاصل نہیں ہوئی
بلکہ انتہائی جاں فشانی اور عرق ریزی کی بدولت نصیب ہوئی ہے۔ انھوں نے افریقہ کی
مالی ترقی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے۔ ان میں کچھ ایسے اصحاب بھی شامل ہیں
جو تھوڑے ہی عرصے پہلے بے روزگاری سے تنگ آ کر یہاں تلاشِ معاش میں آئے تھے
اور جلد ہی برسرِ روزگار ہو کر سرخ رو ہو گئے۔ اہلِ مغرب کے لیے پوری رفٹ ویلی اور
خاص طور سے نیروبی نعمتِ عظمیٰ سے کم نہیں۔ یہاں انھیں وہ سارا سامانِ عیش اور وہ
آسائش میسّر ہیں جن کا وہ ان کے اپنے ملکوں میں خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتے۔
معتدل آب و ہوا، مغربی طرزِ رہائش، صاف ستھرا دل کش ماحول، ملاوٹ سے مبرّا
اشیائے خوردنی کی فراوانی اور ارزانی، خوب صورت احاطوں سے گھرے ہوئے شاندار
بنگلے اور چاق و چوبند خادم اور خادمائیں جو مغربی ملکوں میں کسی بڑے لارڈ یا غیر معمولی
متموّل رئیسوں کا حصہ ہیں۔

نیروبی ایک جدید طرز کا چھوٹا سا خوب صورت شہر تقریباً پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر

واقع ہے۔ خط استوا یہاں سے کوئی سو سوا سو میل کے فاصلے سے گزرتا ہے مگر بلندی کی
وجہ سے یہاں کی آب و ہوا پر کوئی ناخوش گوار اثر نہیں پڑتا۔ ایک بار ماؤنٹ کینیا سے
دامن میں ماؤنٹ کینیا سفاری کلب جاتے ہوئے ہمیں خط استوا سے گزرنے کا اتفاق
ہوا۔ وہاں نشان دہی کے لیے ایک تختی نصب تھی۔ اسے دیکھ کر ہم کار سے اتر پڑے۔
یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم اس مقام پر کھڑے ہیں جس کا تذکرہ جغرافیا کی کتابوں میں
بارہا پڑھا تھا۔ ماحول کی ناقابلِ اعتبار خوش گواری کو دیکھ کر اور محسوس کر کے ایک ہی لمحے
میں وہ سارے تصورات و تاثرات کافور ہوگئے جو طالب علمی کے زمانے سے ذہنوں میں
پال رکھے تھے۔

ایک جانب نیروبی کی بلندی سورج کی شعاعوں کی جاں سوز تپش کے خلاف ڈھال
بنی ہوئی ہے تو دوسری جانب گھنے درختوں کے سایبان نے اسے اپنے سایۂ عاطفت میں
پناہ دے رکھی ہے۔ موسم کی خوش گواری اور دل پذیری کا یہ عالم تھا کہ ہمارے قیام کے
دوران یعنی پچیس سال پہلے تک کسی دفتر یا کسی گھر میں نہ بجلی کے پنکھے کا وجود تھا نہ
ایرکنڈیشنر کا۔ شامیں اور راتیں خنک یا سرد ہوا کرتی تھیں اور سوئٹر پہننا لازمی ہوجاتا تھا۔
ہمارے ملک کے برخلاف یہاں گرمی کا موسم دسمبر سے فروری تک ہوتا ہے اور ان دنوں
دھوپ قدرے تیز ہوجاتی ہے مگر جھلسا دینے والی نہیں۔ بارش سال میں دو بار ہوتی ہے۔
اپریل سے جولائی تک اور پھر اکتوبر سے نومبر تک۔ پہلی بارش برشگالِ کلاں اور دوسری
برشگالِ خُرد کہلاتی ہے۔ سال بھر ہریالی کا عالم رہتا ہے۔ صرف دسمبر سے فروری تک
گھاس قدرے زرد پڑ جاتی ہے۔

جہاں آج نیروبی بسا ہوا ہے وہاں کسی زمانے میں ایک سرسبز و شاداب اور
سدابہار گھنا جنگل تھا۔ اگرچہ اب جنگل میں منگل ہوگیا ہے مگر شادابی اور حسنِ فطرت کی
دل فریبی اب بھی برقرار ہے۔ وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن برسبیلِ تذکرہ سنا تھا کہ

نیروبی کے معنی "پانی کی جگہ" ہوتے ہیں۔

نیروبی شہر دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک شہری مرکز اور دوسرا مضافاتی علاقے۔ شہری مرکز ایک صاف ستھرا علاقہ ہے جو دفاتر، دکانوں، رہائشی ہوٹلوں، سینما گھروں وغیرہ پر مشتمل جدید و قدیم عمارتوں کا حسین امتزاج ہے۔ کافی مختصر سا ہے۔ پیادہ پا ایک اندازہ گھنٹے میں پورے علاقے کا گشت لگایا جاسکتا ہے۔ یہاں کی عمارتوں میں ایک جھونپڑی نما کانفرنس ہال اور دوسری اس سے ملحقہ دفاتر کی مینار نما عمارت 'کینیاٹا سینٹر' کافی انوکھی وضع کی اور نمایاں ہیں۔

بلاشبہ کینیا کے لیے نیروبی انگوٹھی میں نگینے کی طرح خوب صورت، دل کش اور منفرد حیثیت رکھتا ہے اور ہمہ وقت دعوتِ نظارہ دیتا رہتا ہے۔

معانی واشارات

نیو	–	عمارت کی بنیاد، پایہ
گنجان	–	گھنا، ایک دوسرے سے ملا ہوا
گنجان آباد	–	گھنی آبادی والا
ثقافتی	–	کلچرل
سکونت پذیر	–	بسے ہوئے
مغرب زدگی	–	مغربی ملکوں کی تہذیب، رہن سہن اور بول چال کی نقل کرنے کا رجحان
نقوش	–	اثرات
خوش پوش	–	اچھی پوشاک پہننے والا
خوش ذوق	–	اچھا ذوق رکھنے والا
آسائش	–	جسمانی راحت یا آرام

آسائش طلب — جسمانی راحت چاہنے والا

ملبوس — لباس

زیبِ تن کرنا — پہننا

سابق — پچھلا، گزشتہ

صاحبِ حیثیت — عہدے یا دولت کا مالک، اثر ورسوخ رکھنے والا

بے دریغ — بے روک ٹوک، بے سوچے سمجھے

برسرِ اقتدار — حکومت یا اقتدار پر فائز

مرغوب — پسندیدہ

چابک دستی — تیزی، پھرتی

تشخیص — مرض کی تحقیق، چھان بین

عارضہ — بیماری

لاحق — (بروزن فاعل) لگا ہوا، یہ لفظ 'لحق' سے بنا ہے جس کے معنی ہیں لگنا یا جڑنا، عموماً بیماری یا پریشانی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے

رجوع کرنا — دوبارہ کام پر لگانا

مبلغ (مُ بَل لِغ) — کسی مذہب کا پرچار کرنے والا (ج: مبلغین)

طبعاً — فطری طور پر، طبیعت کے اعتبار سے

فقدان — کمی

خورونوش — کھانا پینا

جاں فشانی — سخت محنت کرنا

عرق ریزی — پسینا بہانا مراد بہت محنت کرنا

دقیقہ فروگزاشت نہ کرنا — کسر باقی نہ چھوڑنا، پوری کوشش کرنا

نعمتِ عظمیٰ — بڑی نعمت، بڑی دین

کافور ہونا	– غایب ہونا، مٹ جانا
مبرّا	– عاری، بچا ہوا
اشیائے خوردنی	– کھانے پینے کی چیزیں
فراوانی	– کثرت
ارزانی	– سستا ہونا
متموّل	– مال دار، خوش حال
جاں سوز	– جان کو جلانے والی مراد بہت تکلیف دہ
عاطفت	– بزرگانہ شفقت
دل پذیری	– دل کو پسند آنے کی خصوصیت
خنک	– ہلکی سرد
برشگال	– برسات کا موسم
کلاں	– بڑا
خُرد (خورد)	– چھوٹا
برسبیل تذکرہ	– بات میں بات نکل آنے پر
منقسم	– تقسیم شدہ، بٹا ہوا
امتزاج	– ملاپ
پیادہ پا	– پیدل
ملحقہ	– جڑا ہوا، ملا ہوا (لاحق کی طرح یہ لفظ بھی 'لحق' سے بنا ہے)

مشق و مطالعہ

(الف) ایک یا دو جملوں میں جواب دیجیے۔

۱- کینیا، برطانیہ کے قبضے سے کب آزاد ہوا؟

۲۔ کینیا کے دارالحکومت کا نام کیا ہے؟

۳۔ دفتروں میں کام کرنے والوں کو کون سا لباس پہننا لازمی ہے؟

۴۔ عورتیں روزانہ کون سا لباس پہنتی ہیں؟

۵۔ افریقی قبائل میں کون سا قبیلہ سب پر حاوی ہے؟

۶۔ افریقیوں کی سب سے مرغوب غذا کیا ہے؟

۷۔ افریقی حکومت نے خادموں اور خادماؤں کو کیا سہولت دی ہے؟

۸۔ اچھے کھیل کی داد افریقی کس طرح دیتے ہیں؟

۹۔ نیروبی شہر کتنے فٹ کی بلندی پر واقع ہے؟

۱۰۔ نیروبی شہر کتنے حصوں میں منقسم ہے؟

(ب) مفصل جواب دیجیے۔

۱۔ گکوئی قبیلے کی خصوصیات بیان کیجیے۔

۲۔ افریقیوں میں پیٹ کے کینسر میں کمی کیوں واقع ہوئی ہے؟

۳۔ مصنف نے خادماؤں کے سلسلے میں کون سا سبق آموز واقعہ بیان کیا ہے؟

۴۔ افریقیوں کے کرکٹ سے لگاو کا منظر پیش کیجیے۔

۵۔ کینیا میں بسے ہندوستانی باشندوں نے شعبۂ تجارت میں کس طرح ترقی کی ہے؟

۶۔ اہلِ مغرب کے لیے نیروبی نعمتِ عظمیٰ سے کیوں کم نہیں؟

۷۔ مصنف کو 'ماؤنٹ کینیا سفاری کلب' جاتے ہوئے کیا تجربہ ہوا؟

۸۔ نیروبی تپش کا شکار کیوں نہیں ہے؟

۹۔ نیروبی شہر مرکزی علاقے کی تفصیل بیان کیجیے۔

(ج) درج ذیل محاوروں کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

سرخ رو ہونا۔ دقیقہ فروگزاشت نہ کرنا۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا۔

کافور ہونا۔ رجوع کرنا۔

(د) اپنے کسی یادگار سفر کی تفصیل لکھیے۔

●●●

۷ نمک کا حق

خدیجہ مستور

ولادت: ۱۹۲۷ء
وفات: ۱۹۸۲ء

خدیجہ مستور اردو کی مشہور افسانہ نگار ہیں۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئیں اور وہیں ان کی تعلیم ہوئی۔ بچپن ہی سے انھیں کہانیاں لکھنے کا شوق تھا۔ ان کی کہانیاں اور افسانے مختلف رسائل میں چھپتے رہے۔ تقسیمِ وطن کے بعد وہ پاکستان ہجرت کر گئیں۔ ان کے ناول 'آنگن' اور متعدد افسانوں میں آزادی سے قبل اور اس کے بعد کی معاشرتی کش مکش بہت نمایاں ہے۔ انھوں نے ہند و پاکستان کے مسلم گھرانوں کے بکھراو اور خاندانی اقدار کی پامالی کا ذکر بڑے دردمندانہ اور فکر انگیز انداز میں کیا ہے۔

ذیل کا سبق ان کے ناول 'آنگن' سے لیا گیا ہے۔ اس میں پرانی نسل کی خاندانی اقدار اور ان اقدار سے نئی نسل کے بے خبر رہنے کی داستان کو مختلف کرداروں کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کرداروں میں عالیہ کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

تقسیمِ وطن کے المیے نے یوپی کے مسلمان گھرانوں کی جمی جمائی معاشرت کو جس طرح بکھیر دیا اور دونوں ملکوں میں ان کو جن سماجی و سیاسی مسائل سے دوچار کیا، اس کا فنکارانہ تجزیہ اس ناول میں کیا گیا ہے۔

ذیل کے اقتباس میں اس ناول کے ایک اہم کردار کریمن بوا کی زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ کریمن بوا روایتی قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور نمک کا حق ادا کرنے کو نجات کا وسیلہ جانتی ہیں۔

***

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ عالیہ پڑھتے پڑھتے تھک چکی تھی۔ اس نے کتابیں میز پر رکھ دیں۔ وہ سونا چاہتی تھی مگر سو نہ سکی۔ نچلی منزل میں اچانک سب کے باتیں

کرنے کی آواز آنے لگی۔ وہ اسم یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ زینوں پہ کچھ دیر بعد سب چاپ سنائی دی تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ جمیل بھیا اس کی طرف آ رہے تھے۔

"عالیہ دادی کی طبیعت سخت خراب ہے، ذرا دیر کو نیچے چلو۔"

وہ بہت سنجیدہ ہو رہے تھے۔

"تم گھبراؤگی تو نہیں۔ ایک دن سب پر یہ وقت آتا ہے۔"

اس کا دل زور زور سے دھڑکا۔ وہ سب سمجھ گئی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے پانو کانپ رہے ہیں مگر وہ بڑی ہمت سے جمیل بھیا کے ساتھ ہولی۔ جمیل بھیا اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے مگر اسے تو پتا ہی نہ چل رہا تھا کہ یہ ہاتھ اُسی کا ہے یا کسی غیر کا۔

دادی کی مسہری کھینچ کر اُن کا منہ قبلے کی طرف کر دیا گیا تھا۔ اماں، بڑی چچی اور بڑے چچا مسہری کے اردگرد خاموشی سے کھڑے ہوئے تھے۔ دادی کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ ابھی اُن میں انتظار کا نور باقی تھا۔ شاید وہ اس وقت بھی اپنے سب سے لاڈلے چھوٹے بیٹے کا انتظار کر رہی تھیں۔

کریمن بوا بڑی بے تابی سے مسہری کے چاروں طرف گھوم گھوم کر دعائیں کر رہی تھیں "مولا! مالکن کو صحت دے دے اور بدلے میں مجھے اُٹھا لے۔ مولا۔ مولا۔"

"کریمن بوا یہ کون سی محبت ہے جو تمھارے دل میں ٹھاٹھیں مار رہی ہے؟" —

عالیہ نے بڑھ کر کریمن بوا کو سنبھالنا چاہا، اُنھیں لپٹانا چاہا مگر وہ اپنے کو چھڑا کر پھر دعائیں کرنے لگیں "مولا۔ مولا"۔

ایک ہچکی کے ساتھ دادی کو دائمی سکون مل گیا۔ کریمن بوا ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہ تھا۔ بڑے چچا نے نبض پر سے ہاتھ ہٹا کر دادی کے ہاتھ سینے پر باندھ دیے اور لحاف سے منہ چھپا دیا۔ کریمن بوا سر جھکائے کمرے سے نکل گئیں۔ بڑے چچا کا منہ ضبط کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا اور ان کی

[illegible] تھیں اور دادی جو [illegible]
[illegible] کے محلے میں چلے گئے۔

[illegible] آ گئی۔ کریمن بوا صحن میں اینٹوں کا چولھا بنا کر بڑے سے [illegible]
[illegible] تھیں اور وہ جو اب تک دادی کی موت پر ایک آنسو بھی نہ بہا سکی [illegible]
[illegible] میں آگ کے لرزتے شعلوں کو دیکھ کر سسک اٹھی۔ کریمن بوا نے اس
طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

رات دادی کی مسہری کے پاس بیٹھ کر کٹ گئی۔ اماں اور بڑی چچی اُنھیں
[illegible] بلک بلک کر یاد کر رہی تھیں جیسے اُن کے بغیر دنیا سُونی ہوگئی ہو۔ کریمن بوا [illegible]
ٹھنڈی ہوا میں بیٹھی گیلی لکڑیاں پھونک رہی تھیں اور گود میں رکھے ہوئے قرآن پاک
مل مل کر پڑھے جا رہی تھیں۔ کتنے صبر اور خاموشی سے انھوں نے دادی کی موت
برداشت کر لیا تھا۔ بیسیوں سال سے تنِ تنہا دادی کی خدمت کرنے والی کریمن بوا نے ایک
آنسو بھی نہ بہایا تھا۔

آخر کو صبح ہوگئی۔ کریمن بوا نے صحن میں دری بچھا دی تھی اور محلّے کی عورتیں آ آ کر
جمع ہو رہی تھیں۔ وہ سب اپنے اپنے دکھوں کو یاد کر کے آنسو بہا رہی تھیں۔

جب دادی کو نہلا دھلا کر آخری سفر کے لیے تیار کر دیا گیا تو تمام عورتیں برآمدے
میں ٹاٹ کے پردے کے پیچھے چھپ گئیں۔ صرف کریمن بوا ہاتھ جوڑے لاش کے پاس
کھڑی جانے کیا کہہ رہی تھیں۔

"اندر جاؤ کریمن بوا۔" بڑے چچا نے کریمن بوا کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اللہ کو سونپا مالکن، اللہ کو سونپا۔" کریمن بوا صحن سے ہٹ کر برآمدے میں
آ گئیں۔

دادی کی لاش جب صدر دروازے سے پار ہو رہی تھی تو ایک بار سب چیخ کر

رو پڑے مگر کریمن بوا سر جھکائے صحن میں بکھرا ہوا سامان بٹور رہی تھیں۔ ذرا دیر بعد سب مہمان چلے گئے تو جیسے گھر ایک دم ویران ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔

دوسرے دن سے سب کام اس طرح ہونے لگے جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ صرف اُس وقت دادی کی موت کا احساس شدید ہو جاتا جب کریمن بوا کام سے فارغ ہو کر قرآن شریف پڑھنے بیٹھ جاتیں۔

عالیہ کو کریمن بوا کی محبت پر رشک آنے لگا تھا۔ اس نے کتنی بار چاہا تھا کہ ایک آدھ پارہ پڑھ کر دادی کی روح کو بخش دے مگر اسے فرصت ہی نہ ملتی۔ امتحان کی تیاری سر پر سوار تھی۔ وہ اب پھر دھیان سے پڑھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنا ایک سال دادی کو بخشنے کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ کریمن بوا کی محبت کے مقابلے میں خود کو کم تر سمجھ کر صبر کر لیتی۔

ایک دن جب دوپہر کے سناٹے میں کریمن بوا کے ہولے ہولے قرآن پاک پڑھنے کی آواز جیسے فریاد کرتی معلوم ہو رہی تھی، وہ اپنے کمرے سے نکل کر نیچے اُتر گئی اور تخت پر کریمن بوا کے پاس جا بیٹھی۔ اماں اور بڑی چچی شاید سو رہی تھیں کیونکہ ان کی باتیں کرنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔

کریمن بوا جب تک پڑھتی رہیں، وہ ان کے پاس سر جھکائے بیٹھی رہی اور جب وہ قرآن شریف بند کر کے دعا کرنے لگیں تو عالیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کریمن بوا محبت کی کیسی مثال پیش کر رہی ہیں؟ کام سے تھک کر وہ بھی تو دن میں سو سکتی ہیں۔

"تم سوئی نہیں عالیہ بیٹی؟" دعا ختم کر کے کریمن بوا نے پوچھا۔

"نیند نہیں آئی کریمن بوا اور......" وہ چپ ہوگئی۔

"کیا بھوک لگی ہے بٹیا کو؟ ایک روٹی اُلٹ دوں، آگ جلا کر؟"

"نہیں کریمن بوا، تمھارے پڑھنے کی آواز سے جی بھر آیا ہے۔ تم کو دادی سے کتنی محبت تھی کریمن بوا، شاید دادی بھی تم کو اتنا ہی چاہتی ہوں گی۔"

"کیا مالکن مجھے چاہتی تھیں؟" کریمن بوا نے اُلٹا سوال کر دیا۔
"تم نے دادی کا زمانہ نہیں دیکھا بیٹا، پتا نہیں وہ کسی کو چاہتی بھی تھیں یا نہیں۔ ہاں صرف چھوٹے میاں کو چاہتی تھیں جو پتا نہیں کہاں کھو گئے۔ انھیں خلافت سے لے گئے۔ ہم تو نوکر لوگ تھے عالیہ بیٹا، ہماری کیا حیثیت۔" کریمن بوا نے اپنی پیٹھ پر سے سرکا دی اور اس کی طرف گھوم کر بیٹھ گئیں۔ ان کی پیٹھ پر سیاہ نشان تھے، ایک جگہ سے سفید سفید چربی سی نکلی ہوئی تھی۔
"یہ کیا ہوا تھا کریمن بوا؟" اس نے جلدی سے قمیص نیچے کھینچ دی۔
"میری اماں مالکن کے جہیز میں آئی تھیں۔ میرے ابّا مر گئے تھے، میں چھوٹی تھی۔ پھر جب ذرا بڑی ہوئی تو مالکن نے اپنے گھر کے ایک نوکر سے میری شادی کر دی۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی اس لیے مالکن کی خدمت میں ذرا سی کوتاہی ہو گئی۔ بس یہ اسی کی سزا تھی۔" کریمن بوا سر جھکا کر سوچنے لگی۔
"اللہ! یہ کریمن بوا بھی کیسی معمّا ہیں۔ اتنے ستم سہنے کے بعد بھی جب تک دادی زندہ رہیں، ان پر نچھاور ہوتی رہیں اور اب بھی انھیں نہیں بھولتیں۔ وہ حیران ہو کر ان کا منہ تک رہی تھی۔

"میں نے ساری زندگی ان کا نمک کھایا تھا اور اب بھی ان کی اولاد کا نمک کھا رہی ہوں۔ نمک کا بڑا حق ہوتا ہے بٹیا عالیہ! میری اماں، اللہ انھیں جنّت نصیب کرے، کہتی تھیں کہ جس نے نمک کا حق نہ ادا کیا، وہ خدا کے ہاں بھی معاف نہ کیا جائے گا۔ مالکن کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کر دینا مجھے۔ دوسری دنیا میں تو سکھ کی سانس لے سکوں۔"
کریمن بوا اُٹھ کر جھوٹے برتن سمیٹنے لگیں اور عالیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ کریمن بوا نے نمک کا سارا ڈبّا اس کے منہ میں اُنڈیل دیا ہے جو اُسے زہر سے زیادہ کڑوا لگ رہا ہے۔

معانی و اشارات

دم سادھنا – چپ رہنا، حرکت نہ کرنا

مسہری – چھپر کھٹ، مکھیوں اور مچھروں سے محفوظ رکھنے والا ایک قسم کا پردہ دار پلنگ

آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں – کسی کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ شدت سے انتظار کر رہی تھیں۔

ٹھاٹھیں مارنا – سمندر یا دریا کا اونچی اونچی پُرشور موجیں مارنا

دائمی – کبھی نہ ختم ہونے والا

نبض – ناڑی، کلائی کی وہ رگ جسے مرض یا زندگی کی شناخت کے لیے ٹٹولا جاتا ہے

بیٹھک – دیوان خانہ، مکان کا مردانہ حصہ (ڈرائنگ روم)

صحن – آنگن

شانہ – کاندھا

برآمدہ – مکان کے آگے نکلا ہوا حصہ

صدر دروازہ – بڑا دروازہ، مین گیٹ

فارغ ہو کر – فرصت پا کر

رشک – یہ آرزو کہ جو چیز دوسرے کو حاصل ہے مجھے بھی مل جائے

تخت – گدی، بڑی چوکی

خلافت کا جلسہ – مسلمانوں کی خلافت کا مرکز ترکی میں تھا۔ انگریزوں نے اسے ختم کرنے کی کوشش کی تو ہندوستان میں بھی تحریک خلافت وجود میں آئی جس کی قیادت مولانا محمد علی جوہر نے کی۔ اس سلسلے میں جگہ جگہ جلسے منعقد کیے جاتے تھے۔

انھیں خلافت کے جلسے لے گئے – دادی کے چھوٹے بیٹے تحریکِ خلافت میں شامل ہونے کی وجہ سے انگریزوں کی قید میں تھے

معمّا - پیچیدہ بات، اُلجھا ہوا مسئلہ

ستم - ظلم، زیادتی

نچھاور کرنا - نثار کرنا

نمک کھانا - کسی کی نوکری کرنا، کسی کی دی ہوئی روٹی کھانا

نمک کا حق ادا کرنا - وفاداری کرنا، مالک کی خیر خواہی کرنا

مشق و مطالعہ

(الف) مختصر جواب دیجیے۔

۱- عالیہ گھبرا کر کیوں اُٹھ بیٹھی؟

۲- دادی کی آنکھیں دروازے پر کیوں لگی ہوئی تھیں؟

۳- کریمن بوا کب سسک اُٹھیں؟

۴- کریمن بوا نے دری کیوں بچھائی تھی؟

۵- عالیہ کو کریمن بوا پر رشک کیوں آیا؟

(ب) مفصل جواب دیجیے۔

۱- دادی کے انتقال کے بعد چچا کی کیا حالت ہوئی؟

۲- کریمن بوا نے محبت کی کون سی مثال پیش کی؟

۳- مالکن نے کریمن بوا کو کیوں سزا دی تھی؟

۴- کریمن بوا نے نمک کا حق کس طرح ادا کیا؟

(ج) سیاق و سباق کے حوالے سے جملوں کی وضاحت کیجیے۔

۱- ایک دن سب پر یہ وقت آتا ہے۔

۲- ابھی ان میں انتظار کا نور باقی تھا۔

۳- وہ اپنا ایک سال دادی کو بخشنے کے لیے تیار نہ تھی۔

۴- اللہ یہ کریمن بوا بھی کیسی معمّا ہیں؟

۵- جس نے نمک کا حق ادا نہ کیا، وہ خدا کے ہاں بھی معاف نہ کیا جائے گا۔

(د) درج ذیل محاوروں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

۱- دم سادھنا۔ ۲- آنکھیں دروازے پر لگی ہونا۔

۳- ٹھاٹھیں مارنا۔ ۴- نچھاور کرنا۔

۵- نمک کھانا۔ ۶- نمک کا حق ادا کرنا۔

(ہ) کریمن بوا جیسے کردار ہمارے آس پاس بکھرے پڑے ہیں۔ ایسی ہی کسی ایک شخصیت کے متعلق جسے آپ جانتے ہوں، دس سطریں لکھیے۔

- **زبان کا مطالعہ:** اس سبق کے آخری حصے کو پڑھیے۔ کریمن بوا کے بیان کا عالیہ پر جو اثر ہوا اس پر غور کیجیے۔ کریمن بوا کہتی ہیں: ''دوسری دنیا میں تو سکھ کی سانس لے سکوں''۔ کریمن بوا نے اپنی ماں کی طرح ظلم سہہ کر بھی نمک کا حق ادا کیا۔ اُن کا آخری جملہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ دوسری دنیا میں خود کو سکون کا حق دار سمجھ رہی ہیں۔ عالیہ کو محسوس ہوتا ہے کہ کریمن بوا کی نمک کے حق کی ادائیگی اس کی مجبوری تھی اور وہ دوسری دنیا میں کسی کی غلامی کے لیے تیار نہیں۔ یہ جملہ سبق کا کلائمکس ہے جو مصنفہ کے بیان کی خوبی کو ظاہر کرتا ہے۔

- **مرکب جملہ:** غارِ حرا میں آپؐ پر وحی کا نزول ہوا اور جبریل نے آپؐ کو نبی ہونے کی بشارت دی۔
  اس پورے جملے میں دو کام بیان کیے گئے ہیں اور ہر کام کو الگ الگ فقرے میں فعل سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اس طرح پورا جملہ دو فقروں سے مل کر بنا ہے۔ البتہ ہر فقرہ اپنی جگہ آزاد ہے اور معنی کے لحاظ سے مکمل ہے۔ دونوں فقروں کو حرفِ عطف 'اور' سے جوڑا گیا ہے۔ ایسے جملے کو '**مرکّب جملہ**' کہتے ہیں جس میں دو یا دو سے زیادہ فقرے حرفِ عطف سے جوڑے جاتے ہیں۔ ہر فقرہ آزاد ہوتا ہے اور اپنا فعل رکھتا ہے۔ ذیل کے مرکب جملے دیکھیے۔

۱- وہ قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور نمک کا حق ادا کرنے کو نجات کا وسیلہ جانتی ہیں۔

۲- وہ سونا چاہتی تھی مگر سو نہ سکی۔

۳- کریمن بوا نے دری بچھا دی تھی اور محلّے کی عورتیں آ کر جمع ہو رہی تھیں۔

۴- اس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانے کو بے موقع نہ اُٹھا۔

●●●

(۸) میرا ہم دم، میرا دوست

ڈاکٹر عصمت جاوید

ولادت ۱۹۲۴ء
وفات: ۲۰۰۴ء

عصمت جاوید کا اصلی نام عصمت اللہ تھا۔ اُن کے والد منشی عبدالباقی پونے کے رہنے والے تھے اور سہراب مودی کی منروا موویٹون کمپنی کی فلموں میں مکالمے لکھا کرتے تھے۔ عصمت جاوید نے ممبئی کے انجمن اسلام ہائی اسکول اور اسماعیل یوسف کالج میں تعلیم حاصل کی۔ مراٹھواڑہ یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند لی۔ اسماعیل یوسف کالج اور مراٹھواڑا یونی ورسٹی میں پڑھانے کے بعد اورنگ آباد کو اپنا وطن بنالیا۔

عصمت جاوید ایک شاعر، ادیب، ناقد اور ماہر لسانیات کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں تحریر کی ہیں۔ 'فکر پیا' 'لسانیاتی جائزے' 'ادبی تنقید' 'اردو پر فارسی کے لسانی اثرات' اُن کی چند مشہور کتابیں ہیں۔ انھوں نے علامہ اقبال کی فارسی مثنویوں 'اسرارِ خودی' اور 'رموزِ بے خودی' کا منظوم ترجمہ کیا۔ ان کا شعری مجموعہ 'اکیلا درخت' بھی اہمیت کا حامل ہے۔

ذیل کا مضمون ان کی کتاب 'مقالاتِ عصمت جاوید' سے لیا گیا ہے جس میں انھوں نے اپنے اہلِ قلم دوست اسعد گیلانی سے متعلق اپنے قلبی لگاو کا اظہار کیا ہے۔ عصمت جاوید اور اسعد گیلانی دونوں ہم جماعت اور ہم نوالہ وہم پیالہ تھے۔ اس مضمون میں عصمت جاوید کے ماضی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

***

ڈاکٹر اسعد گیلانی میرے عنفوانِ شباب کے ہم دم و دم ساز تھے اور محرم وہم راز بھی! میرے لیے ان کی موت ایک ذاتی حادثہ بھی تھی، ایک ناقابلِ تلافی نقصان بھی! یہ درست ہے کہ تقریباً نصف صدی کا عرصہ ہوا جب دنیا کے ساتھ ساتھ خود ہماری

[illegible]

[illegible] کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے۔

ان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۹ء میں ہوئی تھی جب میں نے بمبئی کی [illegible] کو انجمن اسلام ہائی اسکول کی انگریزی کی جماعت پنجم میں (جو آج کل کی آٹھویں [illegible] جماعت کے مساوی ہے) داخلہ لیا تھا۔ اس وقت اسعد گیلانی بھی جماعت پنجم میں [illegible] تعلیم تھے۔ ہم دونوں سولہ سال کے رہے ہوں گے۔ جماعت پنجم سے جماعت ہفتم (میٹرک) تک وہ میرے ہم پیالہ و ہم نوالہ رہے۔ یہ تین سال میری زندگی کے وہ یادگار دن ہیں جن کی یاد آج بھی میری زندگی کا عزیز ترین سرمایہ ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اسعد گیلانی اور میں ایک دوسرے کے بالکل قریب آ گئے تھے۔

ہم ایک ساتھ تو اسکول نہیں جاتے تھے کیوں کہ میرا مکان ان کے مکان سے کافی دور تھا البتہ کلاس روم میں ایک ساتھ ایک ہی بینچ پر بیٹھتے تھے اور اسکول بند ہونے کے بعد شام کو جب گھر کی طرف ایک ساتھ پیدل روانہ ہوتے تھے تو کبھی میں ان کے گھر چلا جاتا، کبھی وہ میرے گھر آ جاتے۔ اس طرح ہم ہر روز کافی وقت ایک دوسرے کی صحبت میں گزارتے۔ پھر اتوار اور چھٹی کا دن تو جیسے ہمارا ہی ہوتا۔ ہم اکٹھے پڑھائی بھی کرتے اور اتوار کے دن بلا ناغہ چوپاٹی اور ہینگنگ گارڈن کی سیر کو پیدل نکل جاتے۔ کبھی وکٹوریہ گارڈن میں جا کر بندروں کو چھیڑتے، مونگ پھلی کھلاتے، شیر کو ڈرانے کی کوشش میں خود ڈر جاتے اور پھر درختوں کے کسی جھنڈ کے نیچے بیٹھ کر اُس وقت تک باتیں کرتے رہتے جب تک باغ کے مالی گھنٹا بجا بجا کر باغ کے بند ہونے کے وقت کا اعلان نہ کرتے۔

اسعد گیلانی اپنے دو بڑے بھائیوں رشید احمد گیلانی اور صدیق الحسن گیلانی کے ساتھ سانکلی اسٹریٹ نمبر ۳ میں مصطفےٰ بلڈنگ کے تیسرے منزلے پر فلیٹ نمبر ۳ میں رہتے تھے۔ سب سے بڑے بھائی رشید احمد گیلانی بمبئی میں محکمۂ غذا میں انسپکٹر تھے اور منجھلے

بھائی صدیق الحسن گیلانی محکمۂ ریلوے یعنی جی آئی پی آر (GIPR) میں جو آج
سینٹرل ریلویز کہلاتا ہے، اکاؤنٹس آفیسر تھے۔ اسعد گیلانی کو تعلیم کے سلسلے میں ان
بھائیوں کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ جب میں اسعد گیلانی کے گھر جاتا تو ان دو بھ
سے بھی ملاقات ہوتی۔

اس زمانے میں سائکلی اسٹریٹ بمبئی کی مشہور ادبی گلی تھی جس میں نئی نئی
شخصیتیں رہتی تھیں۔ جناب محمود اسرائیلی بھی جو اپنے وقت کے ممتاز شاعر اور
تھے، اسی گلی میں رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ادبی ہفتہ وار رسالے "تنویر" کا دفتر
اسی گلی میں بلکہ اسعد کی بلڈنگ سے متصل بلڈنگ میں تھا۔ اسے اصغری بیگم سحر
تھیں۔ جوشؔ ملیح آبادی جب بمبئی آتے تو گاہے ماہے انھیں کے ہاں کچھ دنوں
قیام کرتے۔

اسعد گیلانی بمبئی تو بغرضِ تعلیم آ گئے تھے لیکن اس زمانے میں بھی ان کا
پنجاب کے دیہی علاقوں ہی میں رہتا تھا۔ وہ اکثر مجھ سے وہاں کی زندگی کا تذ
کرتے۔ تذکرہ کیا کرتے سماں باندھ دیتے۔ اس زمانے میں ان کے لکھے ہو
افسانوں میں دیہی پنجاب کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے ان سے پنجابی
تھی جو مجھے آج بھی یاد ہے۔

ایک لڑکا جو میری ہی بلڈنگ میں رہتا تھا، اکثر ہمیں آپس میں ادبی گفتگو کر
ہوئے دیکھتا تھا۔ وہ ایک دن کاغذ کے ایک پرزے پر اپنی فرسودہ غزل لکھ لایا اور ہم
رائے طلب کی اور اصلاح کی فرمائش بھی کی۔ غزل کیا تھی، بے معنی الفاظ کا مجموعہ
کسی شعر کا نہ کوئی سر تھا نہ پیر۔ مجھے مذاق کی سوجھی۔ اس سے کہا "واہ آپ تو غا
غالبؔ کے رنگ میں شعر کہتے ہیں۔" غالبؔ سے نسبت پا کر وہ بہت خوش ہوا۔ میں
مزید تعریف کی "آپ کی طرح غالبؔ کے اشعار بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آتے۔ آپ

رنگ میں لکھتے رہیے۔ ماشاء اللہ۔" اس پر اسعد نے رڈا جمایا۔ "غالب کو آم بہت
تھے۔ وہ ایسی عمدہ غزلیں آم کھا کھا کر لکھتے تھے۔" اس سادہ لوح نے آم کھانے کا
کیا۔ میں نے کہا "غالب اپنے دوستوں کو بھی آم کھلاتے تھے۔" بس پھر کیا تھا وہ
عمدہ عمدہ آم کھلا کر نئی نئی غزلیں پیش کرتا اور ہم تعریف کے پُل باندھتے رہتے۔

انجمن اسلام ہائی اسکول میں قبلہ نکہتؔ شاہجہاں پوری ہمیں اُردو اور فارسی
جاتے تھے اور یہ سلسلہ تقریباً تین برس تک جاری رہا۔ نکہتؔ شاہجہاں پوری ہم سے
و ادب کی بہت سی توقعات رکھتے تھے۔ وہ ہمارے لیے صرف ایک روایتی اُستاد نہیں
بلکہ ہم دونوں میں صحیح ادبی ذوق کی تربیت میں ذاتی دلچسپی لیتے تھے۔ اسعد گیلانی اور
اُن کے منہ چڑھے شاگرد تھے۔ اُن سے بحث کرتے تھے اور کبھی کبھی اُن کی اصلاح
تسلیم نہیں کرتے تھے لیکن وہ خندہ پیشانی سے ہمارے ہر اعتراض کا جواب دیتے۔ یہ
ری گستاخیاں کلاس ختم ہونے کے بعد یا اُن کے دولت کدے پر ہوتیں۔ کلاس کے
ران ہم دونوں استاد کا ادب ملحوظ رکھتے۔ کہاں ملیں گے ایسے شفیق و رہنما استاد!

نکہتؔ صاحب نے ہم دونوں کی ادبی صلاحیتوں کو بھانپ لیا تھا اور ہماری ادبی
بیت ایک شفیق باپ کی طرح کرنے لگے تھے۔ وہ ہفتے کے ہفتے مناسب عنوان دے کر
سے مضامین یا انشائیے لکھواتے لیکن ہم دونوں کے لیے نہ ہفتے کی قید تھی اور نہ
وان کی۔ وہ ہمارے مضامین بڑے غور سے پڑھتے اور سرخ روشنائی سے اصلاح
تے جاتے۔ ریمارک انگریزی میں حاشیے میں لکھتے تھے یا مضمون کے آخر میں۔ اُن
ہمت افزائی اور رہنمائی سے ہمارا شوقِ مضمون نویسی نکھرتا گیا۔

ایک مرتبہ ایک ہی عنوان "چوپاٹی کی سیر" پر ہم دونوں نے طبع آزمائی کی۔ میرے
مون پر استاد نے ریمارک دیا۔ Your rival's essay is better than yours.

سے بہتر تھا بلکہ اس لیے کہ استاد نے میرے دوست کو میرا حریف قرار دیا تھا۔ میں

ریمارک اسعد کو دکھایا۔ اسعد کو بھی بہت غصہ آیا اور ہم استاد سے جھگڑنے گئے

نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کا rival (حریف) کیوں قرار دیا۔ انھوں نے

کہ یہ تم دونوں میں جذبۂ مسابقت پیدا کرنے کے لیے تھا، جذبۂ رقابت نہیں۔ ہم

نہ مانے اور استاد سے روٹھ گئے۔ اس پر استاد نے ہم دونوں کو گلے لگا لیا۔

’جب گلے سے لگ گئے سارا گلہ جاتا رہا‘

لیکن اس ریمارک کا مجھ پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ میں اسعد کے مضامین

سے پڑھنے لگا۔ اسعد میں نثر نویسی کی خداداد صلاحیت تھی۔ اس زمانے میں بھی

تحریروں میں غضب کی روانی ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بے تکلف الفاظ

دریا بہہ رہا ہو۔ میری نثر میں تصنع ہوتا تھا۔ اس پر نیاز فتح پوری کی چھاپ تھی۔

effect پیدا کرنے کے لیے تشبیہات کا انبار لگا دیتا، مغلق فارسی ترکیبیں سوچ سوچ

لاتا لیکن اسعد کی تحریر سادہ و پرکار ہوتی تھی۔ صحیح معنوں میں سلیس نثر لکھنا میں نے

سے سیکھا۔

’مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی‘

ہم دونوں کلاس میں اُردو مضمون میں کبھی اوّل اور کبھی دوم آتے۔ اسعد

اوّل ہی آتے۔ جب اسکول میگزین ’بلال نو‘ کے حصۂ اُردو کی خاطر اسٹوڈنٹ ایڈیٹر

انتخاب کا سوال آیا تو ہمارے استاد کے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ہم دونوں میں

کس کا انتخاب کیا جائے۔ چناں چہ ہم دونوں کو اسکول کی تاریخ میں پہلی اور غالباً

بار ایک ساتھ ایڈیٹر چنا گیا۔ اسعد کا نام پہلے چھاپا گیا اور اس کے بعد میرا۔

اسعد کی مرگِ ناگہانی کی خبر میرے لیے صاعقے سے کم نہ تھی۔ شدتِ غم

رو سکا نہ چیخ سکا۔ میں گم سم ان پر لکھے ہوئے مضامین پڑھتا رہا لیکن جب اسعد

ہوئی تو مرحوم حسن کی زبانی کا مضمون پڑھا تو بے اختیار آنسو نکل آئے اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو اس قابل ہوا کہ اور کچھ آج سے ایک تعزیتی جلسے میں مرحوم پر دو حرف بول سکوں۔ اب جب کہ میں خود مرنے والوں کی قطار میں آ کے کھڑا ہوں، سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ ’’کُلُّ نفسٍ ذائقة الموت‘‘!

معانی و اشارات

عنوان	–	آغاز، شروعات
عنوانِ شباب	–	جوانی کا آغاز
ہم دم و دم ساز	–	دوست اور ساتھی
محرم	–	راز دار
تلافی	–	نقصان کا معاوضہ یا بھرپائی
ناقابلِ تلافی	–	جس کی بھرپائی نہ ہو سکے
مختلف النّوع	–	مختلف قسم کے
حوادث	–	(حادثہ کی جمع) مصیبتیں، تکلیفیں
ہم پیالہ و ہم نوالہ	–	ساتھ کھانے پینے والا، مراد گہرا دوست
جی آئی پی آر	–	Grand Indian Peninsula Railways
اہلِ قلم	–	مصنف، شاعر یا مضمون نگار
متصل	–	لگی ہوئی، بہت قریب
گاہے ماہے	–	کبھی کبھار
تذکرہ	–	ذکر، چرچا
سماں باندھنا	–	رنگ جمانا، کیفیت پیدا کرنا

فرسودہ	–	پرانا، گھسا ہوا
نسبت	–	تعلق یا مناسبت
ردّا جمانا	–	دیوار چنتے وقت اینٹوں کی ایک قطار پر دوسری قطار جمانا، مراد ایک جملہ کہہ کر پہلے کی بات کو مضبوط کرنا۔
تعریف کے پل باندھنا	–	بے حد تعریف کرنا جس میں مبالغہ اور جھوٹ شامل ہو
منہ چڑھے شاگرد	–	اُستاد کی محبت کے سبب اُن سے بے تکلف ہو جانے والے شا
خندہ پیشانی	–	خوش مزاجی
گستاخی	–	بے ادبی، شوخی، شرارت
طبع آزمائی کرنا	–	طبیعت کو آزمانا یعنی کسی صنف یا عنوان پر اپنی ذہنی و علمی صلا کو استعمال کرنا۔ عموماً شعر کہنے یا ادبی تخلیق کرنے کے لی محاورہ استعمال ہوتا ہے
ملحوظ رکھنا	–	لحاظ رکھنا، خیال رکھنا
جذبۂ مسابقت	–	مقابلے کا جذبہ
جذبۂ رقابت	–	جلن یا ہم سری کا جذبہ
تصنّع	–	مصنوعی پن، بناوٹ
مُغلَق	–	بہت مشکل، پڑھنے اور سمجھنے میں دشوار
مگر وہ بات کہاں مولوی مَدَن کی سی	–	مراد میری تحریر میں وہ خوبی نہ تھی جو اسعد گیلانی کی تحریر میں تھ یہ مصرع دراصل ایک کہاوت ہے جسے اکبر الٰہ آبادی نے اپ ایک شعر میں استعمال کیا ہے۔

اگرچہ شیخ نے ڈاڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

اسکول میگزین	–	اسکول کا رسالہ جس میں طلبہ کی تحریریں اور اسکول کی سالانہ رو شایع کی جاتی ہے

مرگِ ناگہانی - اچانک موت

صاعقہ - کڑکنے اور زمین پر گرنے والی بجلی

آنسہ - کنواری لڑکیوں کے نام سے پہلے لگنے والا انگریزی کے لفظ 'مس' کا مترادف لفظ

تعزیتی جلسہ - ایسا جلسہ جس میں مرنے والے کو یاد کرکے اس کے وارثوں سے ہمدردی کا اظہار کیا جائے

کُلُّ نفسٍ ذائقۃُ الموتِ - ہر نفس کو موت کا مزا چکھنا ہے (سورۂ آلِ عمران کی ایک آیت)

مشق و مطالعہ

(الف) ایک یا دو جملوں میں جواب دیجیے۔

۱- مصنف کے عنفوانِ شباب کے ہم دم و دم ساز کون تھے؟

۲- ڈاکٹر عصمت جاوید نے کس درس گاہ میں داخلہ لیا تھا؟

۳- بمبئی میں اسعد گیلانی کہاں رہتے تھے؟

۴- بمبئی کی کس گلی کو 'ادبی گلی' کہا گیا ہے؟

۵- اصغری بیگم سحر کون سا رسالہ نکالتی تھیں؟

۶- نکہت شاہ جہاں پوری کون سے مضامین پڑھاتے تھے؟

(ب) مفصّل جواب دیجیے۔

۱- مصنف نے جماعت پنجم تا ہفتم کا سفر اسعد گیلانی کے ساتھ کس طرح طے کیا؟

۲- مصنف اپنے دوست کے ساتھ سیر کے لیے کہاں کہاں جاتے اور وقت کیسے گزارتے تھے؟

۳- سانکلی اسٹریٹ میں کون کون سی ادبی شخصیتیں رہتی تھیں؟

۴- فرسودہ غزل کا واقعہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۵- نکہت صاحب نے مصنف اور اسعد گیلانی کی ادبی تربیت کس طرح کی؟

۶- اسعد گیلانی کی مرگ ناگہانی سے مصنف پر کیا اثر ہوا؟

(ج) مندرجۂ ذیل جملوں کی وضاحت کیجیے۔

۱- میرے لیے ان کی موت ایک ذاتی حادثہ بھی تھی، ایک ناقابلِ تلافی نقصان بھی

۲- وہ ہمیں عمدہ عمدہ آم کھلا کر نئی نئی غزلیں پیش کرتا اور ہم تعریف سے [illegible]
رہتے۔

۳- اسعد کی تحریر سادہ و پُرکار ہوتی تھی۔

(د) درج ذیل محاوروں وتراکیب کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

ہم نوالہ وہم پیالہ ہونا۔ سماں باندھنا۔ تصنع۔ مغلق۔ مرگِ ناگہانی۔

- **زبان کا مطالعہ:** ذیل کے جملے پر غور کیجیے:

غزل کیا تھی، بے معنی الفاظ کا مجموعہ تھا۔

اس میں پہلے ٹکڑے 'غزل کیا تھی' کا مطلب ہوتا ہے، وہ شاعری ایسی نہ تھی
غزل کہا جاسکے۔ قواعد کے اعتبار سے مکمل ہوتے ہوئے بھی مفہوم کے اعتبار سے یہ
نامکمل ٹکڑا ہے۔ اسے اگلے ٹکڑے 'بے معنی الفاظ کا مجموعہ تھا' سے جوڑنے پر یہ مفہوم
ہے کہ اس لڑکے نے جو کچھ پیش کیا اس میں محض لفظوں کو اکٹھا کرلیا گیا تھا۔ دونوں جملو
کو ملاکر کہیں تو جملہ یوں بنے گا:

'وہ غزل غزل نہیں، بے معنی الفاظ کا مجموعہ تھی'۔

اس جملے میں فعل 'تھی' کا تعلق غزل سے ہے اس لیے لفظ غزل کی مطابقت
اس کی جنس مونث ہے۔

اس کے برعکس مصنف کے مرکب جملے میں دو فعل آئے ہیں: 'تھی' اور 'تھا'
میں پہلا فعل لفظ 'غزل' کی مطابقت میں مونث اور دوسرا فعل لفظ 'مجموعہ' کی مطابقت
مذکر آیا ہے۔ ذیل کے جملوں کو دو فعلوں کی جگہ ایک فعل لاکر دوبارہ لکھیے۔

۱- تقریر کیا تھی، بہتا ہوا دریا تھا۔

۲- لڑکی کیا تھی، مُرمُروں کا تھیلا تھا۔

(و)

کُتّے

۹

احمد شاہ بخاری

ولادت: ۱۸۹۸ء
وفات: ۱۹۵۸ء

اصلی نام احمد شاہ بخاری تھا۔ اردو ادب میں پطرس کے قلمی نام سے مشہور ہوئے۔ پنجاب میں پیدا ہوئے۔ انگریزی میں ایم۔اے کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج، لاہور میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ اس کے بعد دہلی ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ ہوگئے اور پھر برسوں تک اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے پر مامور رہے۔ تقسیم وطن کے بعد پاکستان چلے گئے اور پاکستان ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل ہوگئے۔ بعد میں اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے نمایندے مقرر ہوئے۔

پطرس بخاری اُردو کے ان ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے کم لکھنے کے باوجود بہت شہرت حاصل کی۔ ان کی مزاحیہ تحریروں کا مجموعہ "پطرس کے مضامین" کل نو مضامین پر مشتمل ہے لیکن اس کتاب میں قہقہوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ پطرس نے انگریزی ادب کے مطالعے سے جو فایدہ اٹھایا اس کے اثرات ان کی تحریروں میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔

پطرس کی عبارت میں شوخی، شگفتگی، روانی اور بے ساختگی نمایاں ہے۔ لفظوں کے اُلٹ پھیر سے مزاح پیدا کرنا، پُرلطف جملے چُست کرنا اور سماج کے مختلف کرداروں کو مذاق کا موضوع بنا کر ان پر ہنسنا ان کا خاص انداز ہے۔ مضمون 'کتے' پطرس بخاری کا شاہکار ہے۔ کتّوں کے بھونکنے کی کیفیت کو مشاعروں کے پس منظر میں دل چسپ انداز سے بیان کرکے پطرس نے مشاعروں کو بھی نشانۂ طنز بنایا ہے۔ اس مضمون کے کچھ حصے اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔

***

علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا، سلوتریوں سے دریافت کیا، خود
کھپاتے رہے لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتّوں کا فایدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجیے، دو
دیتی ہے۔ بکری کو لیجیے، دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتّے کیا کرتے ہیں؟ ک
لگے "کتّا وفادار جانور ہے۔" اب جناب اگر وفاداری اسی کا نام ہے کہ شام کے سا
بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لیے صبح کے چھے بجے تک بھونکتے چلے گئے
ہم لنڈورے ہی بھلے۔

کل ہی کی بات ہے۔ رات گئے کوئی گیارہ بجے ایک کتّے کی طبیعت جو
گدگدائی، اس نے باہر سڑک پر آکر طرح کا ایک مصرع دیا۔ ایک آدھ منٹ کے
سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتّے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق اُ
کو جو غصہ آیا، ایک حلوائی کے چولھے میں سے باہر لپکے اور بھنّا کر پوری غزل مقطع
کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدر شناس کتّے نے زوروں کی داد دی۔

اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھیے۔ کم بخت بعض تو دو غز
سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔
ہنگامہ برپا ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ "آرڈ
آرڈر" پکارا لیکن ایسے موقعوں پر وہاں کسی کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ اب ان سے کوئی پوچھ
کہ 'تمھیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزما
کرتے۔ یہ گھروں کے درمیان آکر سوتوں کو ستانا کون سی شرافت ہے؟'

اس میں شک نہیں کہ کتّوں سے ہمارے تعلقات کشیدہ ہی رہے ہیں لیکن ہم
قسم لے لیجیے جو ہم نے کبھی ستیاگرہ سے منہ موڑا ہو۔ شاید آپ اس کو تعلّی سمجھیں لیکن
خدا شاہد ہے کہ آج تک کبھی کسی کتّے پر ہاتھ اُٹھ ہی نہ سکا۔ اکثر دوستوں نے صلاح دی
کہ رات کے وقت لاٹھی چھڑی ضرور ہاتھ میں رکھنی چاہیے کہ دافعِ بلیّات ہے لیکن ہم ک

[س]ے خواہ مخواہ عداوت پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پ[ر]
[ا]س درجہ غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ ہمیں اگر اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم
[بز]دل ہیں۔ شاید آپ اس وقت یہ بھی اندازہ لگالیں کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے۔ اگر
آپ نے بھی ہم جیسی طبیعت پائی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ایسے موقع پر آیۃ الکرسی آپ
کے ذہن سے اتر جائے گی۔ اس کی جگہ آپ شاید دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں گے۔
چوں کہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں اس لیے آج تک کتے کے کاٹنے کا اتفاق نہیں ہوا
یعنی کسی کتے نے آج تک ہم کو کبھی نہیں کاٹا۔ اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس
سرگزشت کی بجائے آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا۔ تاریخی مصرع دعائیہ ہوتا کہ 'اس کتے
کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو' ...... لیکن

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگِ رہ بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مصر ہیں، سمجھ لیجیے ہم قبر میں پانو لٹکائے بیٹھے ہیں۔ اور پھر ان کتوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو کچھ نرالے ہیں یعنی ایک تو متعدی مرض ہے، پھر بچوں، بوڑھوں سبھی کو لاحق ہے۔ اگر کوئی بھاری بھرکم، اسفندیار کتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبے کو قایم رکھنے کے لیے بھونک لے تو ہم بھی چار و ناچار کہہ دیں کہ بھئی بھونک! (اگر چہ ایسے وقت میں اس کو زنجیر سے بندھا ہوا ہونا چاہیے) لیکن یہ کم بخت دو روزہ، سہ روزہ، دو دو تین تین تولے کے پلّے بھی بھونکنے سے باز نہیں آتے۔ باریک آواز، ذرا سا پھیپھڑا، اس پر بھی اتنا زور لگا کر بھونکتے ہیں کہ چلتی موٹر کے سامنے آکر گویا اسے روک ہی تو لیں گے۔ اب اگر یہ خاکسار موٹر چلا رہا ہو تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کر دیں لیکن ہر کوئی، یوں ان کی جان بخشی تھوڑا ہی کر دے گا۔

کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے

کے تمام قویٰ معطل کردیتی ہے۔ دکان کے تختے کے نیچے سے ان کا ایک پورا ٹبر باہر سڑک پر آ کر بھونکنے کا کام شروع کر دے تو آپ ہی کہیے ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں؟ اس ہنگامے میں دماغ بھلا کام کرے بھی تو کیا تیر مارے گا۔ بہرحال کتوں کی یہ درجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابلِ نفریں رہی ہے۔ اگر ان کا ایک نمائندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آ کر کہہ دے کہ 'عالی جناب سڑک بند ہے' تو خدا کی قسم ہم بلا چوں و چرا کیے واپس لوٹ جائیں گے۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم نے کتوں کی درخواست پر کئی راتیں سڑک ناپنے میں گزار دی ہیں لیکن پوری مجلس کا یوں متفقہ طور پر سینہ زوری کرنا ایک کمینہ حرکت ہے۔

انگریزی میں ایک مثل ہے کہ "بھونکتے کتے کاٹا نہیں کرتے"۔ یہ بجا سہی لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے۔

معانی و اشارات

علم الحیوانات	– وہ علم جس میں حیوانات کی پیدایش اور ان کے خواص کا ذکر ہو
سلوتری	– جانوروں کا ڈاکٹر
لنڈورا	– بغیر دُم کا، بے سہارا، بے کس
ہم لنڈورے ہی بھلے	– اُردو کی ایک کہاوت ہے 'بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی بھلا'۔ ایک بلّی نے چوہا پکڑنے کے لیے جھپٹا مارا تو اس کی دُم پنجے میں آ گئی۔ چوہے نے زور لگایا تو دُم ٹوٹ گئی۔ چوہا بھاگ کر بل میں جا چھپا۔ بلّی اسے پھسلانے کے لیے بولی "میاں چوہے باہر آ جاؤ تو میں تمھاری دم تمھیں لوٹا دوں گی۔" چوہا اس کی چال کو سمجھ گیا اور بولا "بخشو بی بلّی چوہا لنڈورا ہی بھلا۔" جہاں فایدے کے لالچ میں زیادہ نقصان کا ڈر ہو، وہاں یہ کہاوت استعمال ہوتی ہے۔ پطرس نے مزاح پیدا کرنے کے لیے اس

کہاوت کا ایک ٹکڑا استعمال کیا ہے

طرح کا مصرع دینا	– غزل لکھنے کے لیے ردیف اور قافیہ بتانے کی خاطر کوئی مصرع مہیا دینا، مشاعروں میں مصرعِ طرح پر غزلیں کہی جاتی تھیں
مطلع	– غزل کا پہلا شعر جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں
کہنہ مشق	– مشاق، تجربہ کار
مقطع	– غزل یا قصیدے کا آخری شعر جس میں شاعر کا تخلص ہوتا ہے
قدر شناس	– قدر پہچاننے والا
دوغزلہ	– یکے بعد دیگرے ایک ہی طرح میں نئے مطلع کے ساتھ کہی ہوئی دو غزلیں
سہ غزلہ	– ایک ہی طرح میں تیسری مرتبہ نیا مطلع کہہ کر اشعار میں اضافہ کرنا
فی البدیہہ	– برجستہ، فوراً
طبع آزمائی کرنا	– شعر کہنا، شاعری کرنا
سینہ زوری کرنا	– بے خوف ہو کر غلط کام کرنا، غلط کام کر کے اکڑنا
آرڈر آرڈر پکارنا	– نظم و ضبط برقرار رکھنے کا حکم دینا
تعلّی	– شیخی، اپنی تعریف خود کرنا (شعر میں جب شاعر اپنی تعریف خود بیان کرے تو اسے تعلّی کہتے ہیں)
دافع	– دفع یا دور کرنے والا
بلیّات	– (بَ لِ یْ یَ ا ت) عربی لفظ بَلِیَّۃٌ کی جمع، بلائیں
دافعِ بلیّات	– بلاؤں کو دور کرنے والا
اکتفا	– کافی سمجھنا
اسفندیار	– ایران کا ایک بہادر بادشاہ، مراد بڑا بھاری بھرکم

کشیدہ	– کھنچے ہوئے یعنی خراب (تعلقات)
ستیا گرہ	– ستیا گرہ کے معنی استاد بچوں کو بتائے اور گاندھی جی کا ذکر کرے۔ یہ بھی بتائے کہ یہ لفظ ستیہ (सत्य) اور آ گرہ (आग्रह) سے مل کر بنا ہے، اس لیے اس کا املا ستیا گرہ (یعنی سچائی پر اصرار) ہے، ستیہ گرہ نہیں۔
عداوت	– دشمنی
آیۃ الکرسی / دعائے قنوت	آیۃ الکرسی اور دعائے قنوت کے فرق کو استاد واضح کرے۔
سانحہ	– حادثہ
سرگزشت	– سر پر جو کچھ گزری ہو
مرثیہ	– وہ نظم جو مرنے والے کی یاد میں کہی جائے
مصر ہیں	– اصرار کر رہے ہیں
قویٰ معطل کر دینا	– قوتوں کو ناقابلِ عمل کر دینا، ہوش و حواس زائل کر دینا
قابلِ نفریں	– نفرت کے قابل

توجہ طلب : اکثر مزاح نگار مشہور شعروں میں لفظی یا معنوی ہیر پھیر کر کے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ آپ نے جماعت نہم میں کرنل محمد خان کے مضمون 'کار بکاؤ ہے' میں اس کی مثالیں دیکھی ہیں۔ پطرس نے بھی غالبؔ کے مشہور شعر ؎

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

میں تحریف یعنی ردّ و بدل کر کے 'شبِ غم' کی جگہ 'سگِ رہ' کا ٹکڑا لگایا ہے۔ اس طرح کی مزاحیہ تبدیلی کو 'پیروڈی کرنا' کہا جاتا ہے۔ 'پیروڈی' پوری نظم، غزل یا مضمون کی بھی ہوسکتی ہے۔ پیروڈی (Parody) انگریزی کا لفظ ہے، اردو میں اِسے 'تحریف نگاری' کہا جاتا ہے۔

(الف) مختصر جواب دیجیے۔

۱۔ مصنف کی نگاہ میں کتے کیوں ناکارہ ہوتے ہیں؟

۲۔ مصنف کے دوستوں نے مصنف کو کیا صلاح دی؟

۳۔ کتے کے بھونکنے پر مصنف کی کیا حالت ہوئی؟

۴۔ کتوں میں کون سا متعدی مرض عام ہے؟

۵۔ مصنف کو کتوں پر سب سے بڑا اعتراض کیا ہے؟

۶۔ کتوں کے متعلق انگریزی میں کون سی مثل مشہور ہے؟

(ب) مندرجۂ ذیل سوالات کے جواب تفصیل سے دیجیے۔

۱۔ کتوں کے مشاعرے کا آغاز کس طرح ہوا؟

۲۔ کتوں کو دیکھ کر مصنف کی کیا حالت ہوتی تھی؟

(ج) سیاق وسباق کے حوالے سے مندرجۂ ذیل بیانات کی وضاحت کیجیے۔

۱۔ جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مصر ہیں، سمجھ لیجیے ہم قبر میں پانو لٹکائے بیٹھے ہیں۔

۲۔ کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس درجہ غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ ہمیں اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں۔

۳۔ سرگزشت کی بجائے آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا۔

(د) مندرجۂ ذیل الفاظ یا محاوروں کو اس طرح استعمال کیجیے کہ معنی واضح ہو جائیں۔

دافعِ بلیّات۔ طرح کا مصرع دینا۔ چوں و چرا کرنا۔

سینہ زوری کرنا۔ فی البدیہہ۔

(ہ) کتوں سے متعلق اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنے الفاظ میں قلم بند کیجیے۔

●●●

⑩

گوری ہو گوری

سیّد رفیق حسین

وفات: ۱۹۴۶ء　　　　ولادت: ۱۸۹۴ء

سیّد رفیق حسین لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ حیوانوں کی فطرت کا مطالعہ کرنا ان کا دل چسپ ترین مشغلہ تھا۔ انھوں نے جانوروں کی نفسیات پر کئی افسانے تخلیق کیے ہیں۔ ان میں جانوروں کی فطرت اور مزاج کی عکاسی کے ساتھ مناظرِ فطرت کی حسین اور سچی تصویریں ملتی ہیں۔ موزوں الفاظ کے سہارے رفیق حسین اپنے قاری کو جنگل اور گاؤں کی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔

رفیق حسین کے افسانوں کے دو مجموعے 'آئینۂ حیرت' اور 'شیر کیا سوچتا ہے' شائع ہوکر مقبول ہوئے۔ 'گوری ہو گوری' افسانہ 'شیر کیا سوچتا ہے' سے ماخوذ ہے۔ یہ ایک گائے 'گوری' کی کہانی ہے جو وفاداری اور ایثار کا پیکر ہے۔ اس کہانی میں گوری محبت اور ممتا کی بھی علامت بن گئی ہے۔ ہم نے یہ افسانہ خاص طور سے اس لیے چنا ہے کہ اس میں سیلاب آنے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ناگہانی صورتِ حال کا نقشا بڑی حقیقت پسندی اور فن کاری سے کھینچا گیا ہے، ایسی آفت سے بچاو کی کوششوں کی منظر کشی کی گئی ہے اور ایسی آفت کے سامنے ہمت نہ ہارنے کا درس دیا گیا ہے۔

***

چوماسے کی اندھیاری رات تھی۔ بھیگی بھیگی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی تھی۔ جھینگروں نے جھنکار مچا رکھی تھی۔ مینڈک بول رہے تھے ٹر، ٹر، ٹر۔ پیپل کے سوکھے ڈگالے پر اُلّو کہتا تھا 'ہک ہو، ہک ہو'۔

بسنتی نے کروٹ لی، پھر منھ پر تھپّڑ مارا۔ بولی "ہائے رے۔ ارے رام کیے

ڈانس لاگیں۔"
پیپل پر اُلو بولا" ہک ہو، ہک ہو۔"
چھے مہینے کا بچہ پاس لیٹا تھا، اس پر ہاتھ رکھ لیا اور بسنتی بولی "مری جائے! پھر آئے بیٹھا۔ بولت کیسے ناس پیٹا۔"
اُلو پھر بولا" ہک ہو، ہک ہو۔"
"اجی، او جی اٹھو نا۔ گھگو بولے۔ موہے ڈر لاگے۔ تنی اُڑائے دے۔"
مادھو آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ کھٹیا سے نیچے پیر لٹکایا، جلدی سے پھر اوپر کھینچ لیا۔ گھبرا کر نیچے دیکھا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ چھوٹا سا کچا گھر تھا۔ چھوٹی چمنی کے دھوئیں سے کالی لالٹین تھی۔ دھیمی روشنی میں آنگن بھر جھل جھلا رہا تھا۔ گھر بھر میں پانی بھرا تھا۔
مادھو بولا "جو کا ہُوا رے۔"
بسنتی گھبرا کر اُٹھی۔ پانی دیکھ کر بولی "اجی دیکھت کا ہو۔ ہرے رام، بھیکا کو جگالو۔ ارے رم کلیا کو جگالو۔ پانی آئے گیا رے۔ ارے او بھیکا۔ رم کلیا ہو۔ ارے او رم کلیا۔"
آٹھ برس کی دبلی پتلی رم کلیا جاگی۔ چھے برس کا بھیکا جاگا، دودھ پیتا پاس لیٹا بچہ جاگا۔ یہ رویا، وہ چلائے "چپ کرو چپ" مادھو نے ڈانٹا۔
خاموشی میں مادھو نے کان لگائے۔ بسنتی نے دھیان دیا۔ دور کہیں سے آواز آرہی تھی۔ 'گڑپ شل شل شل۔ گڑپ شل شل شل۔'
گھگو بولا" ہک ہو۔"
کھٹولے سے کود، پانی میں چھپ چھپاتے بچے ماں سے چمٹے۔ مادھو اٹھا۔ دیکھنے کو دروازے کی طرف چلا۔ بسنتی روئی "اجی جاوت کہاں ہو جی۔"
باہر سے آواز آئی "مادھو بھیّا ہو۔ او مادھو۔ ارے باڑھ آئی۔ اُٹھ رے، اُٹھ۔"

شڑپ گڑپ، شل شل، پانی کے بہنے کی آواز تیزی سے بڑھ رہی تھی
'مم مم، میں' بکری بولی 'ہاں ہاں آں' کہیں کھیاں چلا رہی تھیں۔ بارہ گھر
پُروے میں ہل چل مچ گئی۔ سب جاگ اُٹھے۔ سب بھاگنے لگے۔

مادھو نے رم کلیا کو کوٹھے کی سیڑھیوں پر کھڑا کر دیا۔ بھیکا کو گود میں لیا اور
رکھنے اور اٹھانے میں لگ گیا۔ بسنتی نے گود والی لڑکی کو دبائے دبائے تیرتی ہنڈیا بچائی
مٹکا کترایا ہوا پرے سے لکلا جاتا تھا، اُسے پیر سے روکا۔ گھر کے باہر آدمی اور جانور
رہے تھے۔ گھر کے اندر رم کلیا اور بھیکا رو رہے تھے۔ پانی کا شور اندر اور باہر سب
تھا۔ بسنتی اور مادھو گھر کے سامان میں لگے تھے۔ شور ہوا "بھاگو، بھاگو۔ او بسنتی
ارے مادھو بھاگ۔"

پانی نے ہچکولا لیا۔ پنڈلی سے اُچکا، رانوں تک آیا۔

"بھاگو، بھاگو۔ مادھو بھیا بھاگو رے۔ ارے کا ہوئے گوا؟ نِکلت کا ہے ناہیں؟"
باہر سے آوازیں آئیں۔

پانی نے پھر ہچکولا لیا۔ آگے بڑھا، پیچھے ہٹا اور ران سے کمر تک آیا۔ بسنتی
"ارے مورے گڑوے، اری موری ہنسلی تو نکال لے رے۔"

"چل چل تو چل نکل۔ میں لایا۔ ارے نون، چون تو لے لوں۔ اوڑھنا بچھونا
دبائے لوں۔"

پانی کا شور تھا۔ چار آدمیوں کا چلّانا تھا۔ دروازے پر دھکّے تھے۔ وہ کھل گیا
آدمی گھر میں آ گئے۔ مادھو اور بسنتی کو پکڑ کر گھسیٹا۔ "چالو چالو، سب چھوڑو۔ جان کی
بچائے لو۔ چالو۔ چالو۔"

اِس گڑبڑ میں، جلدی میں، گھبراہٹ میں، اندھیرے میں، دری، بچھونے
کپڑوں کے لیے پکارتی، برتنوں اور زیوروں کے لیے بھڑکتی بسنتی نے یہ بھی

بچھاڑے رم کلیا کو لے لے رے۔" لالٹین ڈوب چکی تھی۔ اندھیرے میں کسی نے
جواب دیا "موں اٹھائے لوں۔ تو تو چل۔ اری نکس باہر ہے۔"

پانی کی شل شل، رات اندھیری، بادل کی گرج، کمر کمر، سینے سینے پانی میں بیس تیس آدمی پچاس ساٹھ مویشی چلے۔ ہر آدمی بول رہا تھا، ہر جانور چلا رہا تھا۔ کوئی گرتا تھا دوسرا سنبھالتا تھا، کوئی ڈوبتا تھا، دوسرا اُبھارتا تھا۔ شروع میں تو سب جتھا بنائے، ایک دوسرے کو سنبھالتے پُروے سے باہر چلے۔ آموں کے باغ کے اندر سے آ کر جہاں نکل کے فاصلے پر ریل کی پٹری کا رُخ کیا لیکن جوں جوں آگے بڑھتے گئے، اندھیرے میں ایک دوسرے سے الگ ہوتے گئے۔

اندھیری رات تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پانی کمر کمر اونچا تھا۔ ساتھی سب بچھڑ بچھڑ کر الگ ہو گئے تھے۔ اِدھر اُدھر، دور اور نزدیک آوازیں آ رہی تھیں۔

"جانکی ہو جانکی۔"

"آئے رہوں دادا۔"

"مرلی ہو مرلی۔"

"بھلا رے بھلا۔ چالے چالو۔"

ڈکراتی بھینسیں، چلّاتی گئیں، ممیاتی بکریاں، روتے بچّے، سہمی عورتیں، پکارتے مرد، سب بھیگے، سب پانی ٹپ ٹپاتے ریل کی پٹری پر چڑھے۔ اندھیری رات میں سونی پٹری آباد ہوگئی۔ لوگوں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر پوچھنا شروع کر دیا کہ کون کون آ گیا ہے۔ کون کون رہ گیا ہے۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی کی فکر تھی۔ چھوٹے سے پُروے کی پوری آبادی کی مردم شماری کی گئی۔ آدمیوں اور جانوروں دونوں کی گنتی کی گئی۔ جانور سب موجود تھے۔ آدمیوں میں ایک چمار کا لڑکا اور بچوں میں رم کلیا کم تھی۔

بسنتی نے رم کلیا کے واسطے اور چمار چمارن نے لڑکے کے واسطے بلک بلک کر

رونا شروع کر دیا۔ مادھو بھی چپکا کھڑا روتا تھا۔ وہیں پر اُن کی گوری گائے کھڑی
تھی۔ "تو کاں آں ھ۔ تو کاں آں ھ۔" یہ بھی دکھ پیٹی ماں ہے۔ ارے کوئی جانے
جانے بچھڑا اس کا بھی نہیں ملتا ہے۔ دکھیا روتی ہے۔ "تو کاں آں ھ" روتی ہچکیاں
بسنتی کے پاس بولتی ہوئی گائے آئی۔ بسنتی نے اس کی گردن میں باہیں ڈال دیں
رونے لگی۔

"گوری رے موری رم کلیا.......... اِھ اِھ اِھ اِھ۔
گوری رے اب تو ہے کون چرائے.......... اِھ اِھ اِھ اِھ۔"
گائے نے وہی لمبی آواز نکالی —— "تو کاں آں ھ"۔

کوئی جانے نہ جانے، دل کی لگی رام جانے۔ گائے نے چلا چلا کر اور بسنتی نے
سسکیاں لے لے کر آخر صبح کر ہی دی۔ نکلتے دن کی پہلی روشنی میں سب کی آنکھیں گو
پُروے کی طرف اُٹھ گئیں۔ سامنے چھوٹا سا آموں کا باغ تھا۔ اُسی کے برابر اور کچھ اُس
کی آڑ میں گوجر پُرا آباد تھے۔ لیکن اب وہاں کچھ نہ تھا۔ اگر کوئی بچا کھچا مکان ہوگا تو
درختوں کی آڑ میں ہوگا۔ سامنے تو باغ ہی باغ تھا جس کے درخت اپنے ہرے ہرے
ہاتھ پانی پر پھیلائے ہل رہے تھے۔ اور پھر اُن کے پار میلوں میلوں جہاں جہاں تک نظر
جاتی پانی ہی پانی تھا۔

جب تک اندھیرا رہا ہڑپ، گڑپ، گڑاپ کرتے پانی نے رم کلیا کو خوب ہی
ڈرایا۔ اور روتے روتے بے دم، گز بھر کی لڑکی کا آنے والے دن نے بھینی بھینی روشنی
پھیلا کر دل ہی دہلا دیا۔ ایک ہی دفعہ میں چونک کر دیکھتی ہے تو نہ مکان ہیں نہ گاؤں
ہے۔ آدھے سے زیادہ کوٹھا بہہ چکا ہے۔ ایک کونے پر خود بیٹھی ہے۔ دوسرے کونے پر
کالا سانپ کنڈلی مارے، بل کھایا بیٹھا دوہری زبان نکال رہا ہے۔ سامنے چاروں طرف
پانی ہی پانی ہے۔

رم کلیا نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں موند لی تھیں اور "اری میا ری۔ او موری
... بلک رہی تھی کہ اس کے کان میں آواز آئی "تو کاں آں رے۔"
رم کلیا چونکی۔ ہاتھ آنکھوں پر سے ہٹے۔ آنسو بہتے تھم سے، ہلکی مسکراہٹ آئی۔
"تو کاں آں رے" آواز پھر آئی۔
رم کلیا نے "ہرے رام، گوری بولے" کہتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ گائے
تھی تو کوئی نہیں لیکن رم کلیا نے پوری طاقت سے پکارا "گوری ہو گوری۔"
جواب آیا "تو کاں آں رے"
اور پھر باغ میں سے تیرتی ہوئی گائے نکلی۔ رم کلیا نے پھر پکارا۔ وہ اُسی کی طرف
...تی ہوئی بڑھی لیکن دور سے ایک اور آواز آئی "او ماں آں رے"۔
باغ کی آڑ سے بچھڑے کی آواز تھی۔ گائے اس آواز کی طرف گھوم پڑی۔ رم کلیا
کا ننھا سا دل بیٹھنے لگا۔ وہ رات بھر رونے اور ہچکیاں لینے سے تھک چکی تھی۔ پھر بھی اپنی
سکت بھر چلائی۔

"گوری ہو گوری" .... "گوری ہو گوری۔"
"ارے گوری رے آئے جا" "گوری میا آئے جاری۔"

لیکن گوری نے رخ نہ بدلا۔ البتہ دو چار دفعہ سر گھما کر رم کلیا کی طرف دیکھا۔
ازاکر بولی اور پھر اُدھر ہی تیرتی چلی گئی جدھر سے بچھڑے کی آواز آ رہی تھی۔
باغ کی آڑ سے نکلتے ہی گائے کو بچھڑا اسی جگہ تیرتا ہوا نظر آیا جہاں سرِ شام وہ،
اس کا بچھڑا اور بیل باندھے گئے تھے۔ اب وہاں نہ کھیت تھا نہ جھونپڑی۔ جگہ وہی تھی
لیکن اب سوائے پانی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ بچے کی آواز کا جواب دیتی، تیرتی تیرتی اُس
کے پاس گئی۔ چاروں طرف گھومی۔ اُسے سونگھا۔ ایک دفعہ اس کی تھوتھنی بھی چاٹ لی
اور پھر ایک طرف کو تیرتی چلی گئی۔ مگر بچہ نہ چلا۔ وہیں تیرتا رہا۔ گائے پھر لوٹ آئی۔

چاروں طرف گھومی۔ برابر آ کر اپنی کمر اور پیٹ سے اسے دھکیلا پھر ایک طرف
بچہ ساتھ نہ آیا تو پھر لوٹ آئی۔ اب وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ بچہ
ہوئے کھونٹے میں رسّی سے بندھا ہوا تھا اور رسّی بس اس قدر لمبی تھی کہ اب تک
کسی طرح بچھڑے کی ناک پانی سے باہر تھی لیکن اگر پانی ایک انچ بھی اور بڑھ
رسّی کی وجہ سے ناک ڈوب ہی جائے۔ گائے نے مایوس ہو کر چلّاتے
اور پھر رم کلیا کی طرف رخ کیا۔

رم کلیا رونے چلانے کی تھکن، ڈر اور خوف اور آخر میں انتہائی ناامیدی کا
تک مقابلہ کرتی رہی تھی لیکن آخر آٹھ برس کی ننھی جان ہی تو تھی۔ گائے جب
پاس آئی تو وہ گرتی ہوئی چھت کے کنارے بے ہوش پڑی تھی۔ گوری نے
آوازیں دیں اور جب بھی رم کلیا کو ہوش نہ آیا تو پھر کھردری گرم گرم زبان سے
منھ چاٹا۔ لڑکی کو ہوش آ گیا۔ پہلے تو ڈری۔ پھر گوری کو دیکھا۔

"گوری میّا...... گوری میّا" کہتی ہوئی اس کے گلے میں چمٹی۔ گوری نے
مارے آگے بڑھی۔ رم کلیا چھت سے گھسٹ کر پانی میں آ گئی۔ اس نے ڈر کے مارے
پیر چلائے اور گوری کی پیٹھ پر آ گئی اور وہیں چھپکلی کی طرح لیٹی لیٹی چمٹ گئی۔ گوری
بچھڑے کے پاس آئی۔ وہی حرکتیں پھر کیں۔ کئی دفعہ اس کے گرد چکر لگائے اور چلی
جب بچھڑا ساتھ نہ چلا تو لوٹ آئی۔ اب رم کلیا کی بھی سمجھ میں آ گیا کہ کیا بات ہے۔

جیسے ہی ایک دفعہ پھر گائے تیرتی ہوئی بچھڑے کے پاس گئی، رم کلیا نے اوندھے
منھ لیٹے لیٹے ایک ہاتھ بڑھا کر بچھڑے کے گلے سے رسّی کی گانٹھ نکال دی۔ بچھڑا آزاد
ہو گیا۔ گائے اور بچھڑا دونوں تیرتے ہوئے چلے۔ رم کلیا گائے پر چمٹی ہوئی تھی۔ باغ اور
ریل کی پٹری کی طرف سے دھار چلی آ رہی تھی۔ یہ دونوں بہاو ہی کی طرف تیرتے چل
دیے اور ڈھائی گھنٹے کے بعد بہت چکر کھا کر پھر اسی ریل کی پٹری پر چڑھ آئے۔

دن کے بارہ بجے جس وقت آگے آگے گوری، پیٹھ پہ رم کلیا، پیچھے بچھڑا "تو کاں آں ھ" اور "او ماں آں ھ" کے سوال جواب کرتے گاؤں والوں میں پہنچے تو مل چل مچ گئی۔ لوگ مارے خوشی کے کودتے تھے۔ بسنتی خوشی کے مارے دھاروں دھار روتی ہوئی کبھی رم کلیا کو گلے لگاتی تھی، کبھی بچھڑے کو اور کبھی گوری سے چپٹتی تھی اور گانے کہتی تھی

"تم ماں آں ھ۔ ہم ماں آں ھ"

اچانک سب چلّائے

"بول گوری میّا کی جے"..... "بول گو ماتا کی جے۔"

معانی واشارات

چَوماسا – برسات

جھنکار – جھینگروں کی آواز

ڈانس – بڑا مچھر

مری جائے – مرجائے

پھر آئے بیٹھا – پھر آ بیٹھا

ناس پیٹا – (گالی) منحوس، تباہی لانے والا

گُھگّو – اُلّو

تنی اڑائے دے – ذرا اُڑا دینا

جو کا ہوا رے – ارے یہ کیا ہوا

اجی دیکھت کا ہو – اجی دیکھتے کیا ہو

کھٹولا – چھوٹی چارپائی

اجی جادت کہاں ہو – اجی کہاں جا رہے ہو

باڑھ – سیلاب

گئیاں – گائیں

ارے کا ہوئے گوا – ارے کیا ہو گیا

نکلت کا ہے نا ہیں – نکلتے کیوں نہیں

گڑوا / ہنسلی – ہاتھ اور گلے کا زیور

نون چون – نمک آٹا

اوڑھنا بچھورا – اوڑھنا بچھونا

موں اٹھائے لوں – میں اٹھا لیتا ہوں

نکس باہرے – نکل باہر

آئے رہوں – آ رہی ہوں

بھلا رے بھلا – سب ٹھیک ہے

پُروا / پُرا – بستی، محلّہ

دکھ پیٹی – دکھیاری

رم کلیا – رام کلی

گوجر – گوالا، مویشی پالنے والا

گوجر پُرا – گوالوں کی بستی (دیہات میں الگ الگ پیشہ وروں اور ذات پات والوں کی بستیاں الگ ہوا کرتی تھیں۔ آج بھی یہ صورت حال زیادہ نہیں بدلی ہے۔)

چالو چالو – چلو چلو

مشق و مطالعہ

(الف) ایک یا دو جملوں میں جواب دیجیے۔

۱۔ باڑھ آنے کا پتا مادھو کو کیسے چلا؟

۲۔ ریل کی پٹری تباہ ہونے کے بعد لوگوں نے کیا کیا؟

۳۔ آدمیوں اور جانوروں کی گنتی کرنے کے بعد کس کس کا پتا نہیں تھا؟

۴۔ بیس تیس آدمی اور پچاس ساٹھ مویشی پُروے سے باہر چلے تو ان کی کیا حالت تھی؟

۵۔ گوری اور بچھڑے کے درمیان کس طرح رابطہ ہوا؟

(ب) مفصل جواب دیجیے۔

۱۔ باڑھ آنے سے پہلے مادھو کے گھر کا حال کیا تھا؟

۲۔ مصنف نے باڑھ کے منظر کو کس طرح بیان کیا ہے؟

۳۔ گوری نے کس طرح بچھڑے اور رم کلیا کی جان بچائی؟

۴۔ گاؤں کی زندگی میں مویشی اور آدمی کس طرح ہم آہنگ ہوتے ہیں؟

(ج) مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کیجیے۔

۱۔ آٹھ برس کی دبلی پتلی رم کلیا جاگی۔ چھے برس کا بھیکا جاگا، دودھ پیتا پاس لیٹا بچہ جاگا۔ یہ رویا، وہ چلائے۔

۲۔ دھیمی روشنی میں آنگن بھر جھل جھل رہا تھا۔

۳۔ کوئی جانے نہ جانے، دل کی لگی رام جانے۔

۴۔ ایک کونے میں خود بیٹھی ہے۔ دوسرے کونے میں کالا سانپ کنڈلی مارے، بل کھایا بیٹھا دوہری زبان نکال رہا ہے۔

(د) درج ذیل محاوروں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

رخ کرنا، ہچکیاں لینا، دل دہلا دینا، بل کھانا،

دل بیٹھنا، دھاروں دھار رونا، گلے لگانا۔

●●●

ولادت: ۱۹۰۶ء

وفات: ۱۹۹۳ء

مالک رام بویچہ قصبہ پھالیہ، ضلع گجرات (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ چار سال کے تھے کہ انھیں گوردوارہ پھالیہ میں داخل کردیا گیا جہاں انھوں نے گورمکھی سیکھی اور گوروبانی کی تعلیم پائی۔ ۱۹۲۰ء میں بڑے بھائی ایشر داس کے پاس وزیرآباد ضلع گوجرانوالہ میں چلے گئے جہاں سے انھوں نے ہائی اسکول پاس کیا۔ ۱۹۲۸ء میں بی۔اے ۱۹۳۰ء میں ایم۔اے اور ۱۹۳۲ء میں ایل۔ایل۔بی کے امتحان پاس کیے۔

مالک رام نے صحافت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ لاہور کے مشہور رسالے 'نیرنگِ خیال' سے وابستہ رہے۔ ۱۹۳۶ میں دلّی آئے اور یہاں ہوم ڈپارٹمنٹ کے محکمۂ اطلاعات میں ملازم ہوگئے۔ ۱۹۳۹ء میں حکومتِ ہند کے محکمۂ تجارت میں تقرر ہوا اور کولکاتا میں تین ہفتے کی ٹریننگ کے بعد انھیں مصر بھیج دیا گیا۔ اگست ۱۹۳۹ء سے ۱۹۵۰ء تک مالک رام مصر میں رہے۔ اپریل ۱۹۶۵ء میں اپنے فرائضِ منصبی سے سبک دوش ہوئے۔

مالک رام اردو کے علاوہ انگریزی، فارسی، عربی، فرانسیسی زبانیں بھی جانتے تھے۔ تاریخ اور مختلف روایات کے تقابلی مطالعے کے ساتھ تفسیر و حدیث اور اسلامیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر لکھا ہے۔ غالبؔ اور ابوالکلام آزادؔ ان کے پسندیدہ موضوع تھے۔ 'ذکرِ غالبؔ' 'تلامذۂ غالبؔ' 'گفتارِ غالبؔ' 'تذکرۂ ماہ و سال' 'المراۃ فی الاسلام' اور 'قرآن اور عورت' ان کی قابلِ ذکر تصانیف ہیں۔

مالک رام بنیادی طور پر محقق ہیں اور جس موضوع پر لکھتے ہیں پوری چھان پھٹک

اور تحقیق کے بعد لکھتے ہیں۔ انھوں نے بعض اہم ادبی شخصیتوں کے خاکے بھی لکھے ہیں جن میں ذاتی مشاہدے کے ساتھ شخصیات کے بارے میں ضروری معلومات بھی شامل کی ہے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ 'وہ صورتیں الٰہی' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ 'سائل دہلوی' دلّی کے ایک بزرگ شاعر کا خاکہ ہے جس میں سائل صاحب کے مکان اور حلیے کی تفصیل سے مالک رام کی باریک بین نگاہ اور مشاہدے کی گہرائی کا پتا چلتا ہے۔ قدیم طرزِ شاعری اور اخلاق کے حامل ایک بزرگ فن کار کو مالک رام نے جس طرح یاد کیا ہے وہ ان کی ادب شناسی کی روشن دلیل ہے۔

***

تعلیم ختم کرنے کے بعد دو تین برس تک روزگار کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتا رہا لیکن کسی جگہ قدم نہ جم سکے۔ اِن ایّام میں یہاں دلّی میں میرے ایک مہربان تھے جنھیں اس بات کی فکر تھی کہ کسی جگہ میرے لیے مستقل ٹھکانا ہوجائے۔ انھوں نے ۱۹۳۵ء کی گرمیوں میں مجھے لکھا کہ "تم یہاں آجاؤ، تو شاید ریڈیو کے محکمے میں تمھارا انتظام ہوجائے۔" چناں چہ میں یہاں آگیا۔ یہ دلّی میں میری پہلی آمد تھی۔ اپنے رجحانات کے باعث مجھے اس عروس البلاد سے جو دل چسپی ہوسکتی تھی، اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہاں پہنچ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی ہوگی۔

اس زمانے میں یہاں میرے ایک ہم وطن دوست جگت سنگھ رہتے تھے۔ ساتھ کے کھیلے ہوئے، ساتھ کے پڑھے ہوئے، یوں سمجھیے، دانت کاٹی روٹی والا معاملہ تھا۔ وہ ایک اسکول میں مدرّس تھے۔ میں انھی کے ہاں اُترا۔ دو تین دن بعد ایک صبح وہ مجھ سے کہنے لگے "تمھیں اردو لکھنے پڑھنے کا شوق ہے، کسی دن فرصت ملے تو لال کنواں میں ایک بوڑھے نواب صاحب رہتے ہیں، سراج الدین خاں نام ہے، ان سے جا کر ضرور ملو۔" میں نے پوچھا "کون نواب سراج الدین احمد خاں؟ وہی تو نہیں جو سائلؔ تخلّص کرتے ہیں؟" کہا "ہاں، ہاں، وہی۔" اگلے دن اتوار تھا۔ میں نے ناشتے کے بعد لال

کنویں کی راہ لی۔

حکمت سنگھ کو سائل صاحب کے مکان کا ٹھیک علم نہیں تھا۔ وہ بس اتنا جانتے تھے
کہ لال کنویں میں کہیں رہتے ہیں۔ میں پوچھتا پاچھتا گلی قاسم جان میں جا پہنچا۔ ایک
آدمی سے پوچھا کہ نواب مرزا سراج الدین احمد خاں کے ہاں جانا چاہتا ہوں۔ میں اس
وقت نواب ضمیر الدین احمد خاں عرف ضمیر مرزا خلف نواب علاء الدین احمد خاں بہادر
کے مکان کے سامنے تھا۔ اس شخص نے جواب دیا "یہاں سے دریافت فرمائیے۔" میں
نے مڑ کر دیکھا تو میرے سامنے ضمیر مرزا کا ملازم کھڑا تھا۔ میں نے اپنا سوال اس سے
دہرایا، اس نے کہا "جناب، وہ اس گلی میں نہیں رہتے۔ ان کا مکان لال دروازے میں
ہے۔" مجھے شبہہ ہوا کہ شاید اسے نام سننے میں کچھ غلطی ہوئی ہے، اس لیے میں نے
دوبارہ تاکید سے کہا کہ "میں نواب سراج الدین احمد خاں صاحب کے ہاں جانا چاہتا
ہوں۔" "جی ہاں، میں سمجھ گیا، وہی نا جو شاعر ہیں۔ وہ لال دروازے میں رہتے ہیں۔
آئیے میں آپ کو پہنچائے آتا ہوں۔"

چناں چہ ہم دونوں گلی قاسم جان سے نکل کر لال کنویں میں آ گئے۔ لال دروازہ
کچھ دور تو ہے نہیں۔ یہی چند قدم کا فاصلہ ہے۔ اس کے اندر تھوڑی دور چل کے وہ
سیدھے ہاتھ پر ایک اونچی کرسی کے مکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "لیجیے حضور، یہ ہے
نواب صاحب کا مکان۔" اس کے بعد اس نے ملازم کو آواز دی اور میری طرف اشارہ
کرتے ہوئے اس سے کہا "آپ نواب صاحب سے ملنا چاہتے ہیں" اور مجھے اس کے
سپرد کر کے خود واپس چلا گیا۔

میں ملازم کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ کے ڈیوڑھی میں آیا۔ یہاں اندر گھستے ہی
دائیں طرف ایک چھوٹی سی کوٹھری یقیناً ملازم کے لیے تھی۔ اسی طرف کے کونے میں اوپر
جانے کا زینہ تھا۔ سامنے کے رُخ پر ایک دروازہ تھا، جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ یہ گھر کے

صحن میں ملتا تھا۔ پیش طاق پر ایک تختی لگی تھی، جس پر لکھا تھا۔ "مکان اا لی بیگم۔"
دائنے ہاتھ بغل میں بیٹھنے کا کمرہ تھا جس میں داخل ہونے کے لیے دو سیڑھیاں
چڑھنا پڑتی تھیں۔ ملازم نے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے یہاں بٹھا کے خود نواب
صاحب کی خدمت میں اطلاع دینے چلا گیا۔

میں نے اپنے ارد گرد نگاہ ڈالی، تو دیکھا کہ وہاں اچھا خاصا مشرقی اور مغربی تمدن کا
امتزاج ہو رہا ہے۔ یعنی کمرے میں دری کا فرش، اس کے اوپر نصف کمرے تک لگ بھگ
سفید بُراق چاندنی بچھی تھی۔ صدر میں ایک چھوٹا سا ایرانی قالین اور دو بڑے بڑے
گاؤ تکیے لگے رکھے تھے۔ نشست کے قریب چاندی کا پاندان، پیچوان اور لگن، دو تین
اُگال دان اور سگریٹ کی راکھ جھاڑنے کی پیالیاں دھری تھیں اور جہاں چاندنی نہیں تھی
وہاں چند کرسیاں اور ایک چھوٹی سی تپائی رکھی تھی۔ میں یہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک نورانی صورت بزرگ داخل ہوئے۔ تقریباً ستر
برس کا سن، کوئی پونے چھ فٹ کا قد، کمر میں خفیف سا خم، میدہ وشہاب کی ملی جلی رنگت،
لمبوترا کتابی چہرہ، کشادہ پیشانی، اونچی کاٹھی کی لمبی عقابی قسم کی نوک دار ناک، کلّے کی
ہڈیاں نمایاں طور پر اُبھری ہوئیں۔ سڈول جسم، سنہری جھلک مارتی ہوئی سپید ڈاڑھی، جو
یک مشت تو یقیناً تھی، دو انگشت کی خدا جانے۔ شرعی لبیں، آنکھیں نسبتاً چھوٹی، لمبے لمبے
بازو اور ہاتھ پاؤں۔ سر پر ہلکی سی پلّے کی ٹوپی، جس کے نیچے سے لمبے لمبے کھچڑی بال
نکلے پڑتے تھے۔ گلے میں کاج پٹی، گریبان اور کھلی آستینوں کا ململ کا کُرتا، کندھے پر
رومال، نیچے لٹھے کا آڑا پاجامہ، پاؤں میں خورد نوک کا جوتا، دائیں ہاتھ میں لکڑی اور
بائیں میں سگریٹ کا بکس اور دیا سلائی کی ڈبیا۔

میں اُٹھ کے آداب بجا لایا۔ بہت لطف سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ پہلے
مجھے بٹھایا، پھر خود دوسری کرسی پر تشریف فرما ہوئے۔ نام پوچھا، مقام پوچھا، تعلیم اور

روزگار کا حال پوچھا۔

ہم جس کمرے میں بیٹھے تھے، یہ گلی کے رُخ پر تھا اور یہاں کی تینوں کھڑکیاں
تھیں۔ نیچے گلی میں ایک ٹھٹھیرا برتنوں کی مرمت کر رہا تھا۔ قدرتاً شور ہونا ہی چاہیے
متواتر بے ہنگم آواز سے میں بہت پریشان تھا، یہاں تک کہ بعض اوقات ہمیں
دوسرے کی بات سننے میں بھی تکلف ہوتا تھا۔ لیکن کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ سائل صا
بھی اس کھٹا کھٹ سے منغّض ہوئے۔ گھبرا کے آواز دی "ارے کوئی ہے؟"

دروازے پر سے ملازم نے جواب دیا "حضور حاضر ہوں۔"

"میاں، جاؤ، اس نیک بخت سے کہو کہ یہ شور بند کرے اور اگر اس کے بغیر نہ
رہ سکتا، تو اس سے کہہ دو کہ یہ محلّہ چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے۔ یہ کیا مصیبت نازل ہوئی
ہے!"

ملازم نے جا کے سمجھا دیا ہوگا۔ بہر حال آواز بند ہو گئی اور ہم اطمینان سے بیٹھے
باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اجازت چاہی۔ فرمایا "جب طبیعت چاہے
چلے آؤ! میں دوپہر تک بالعموم مکان ہی پر رہتا ہوں، سرِ شام کبھی کبھی گھومنے نکلتا ہوں۔"
یہ تھی سائل صاحب سے میری پہلی ملاقات۔

اب تفصیل میں کیا جاؤں کہ کیسے کیسے ہمارے تعلّقات میں گہرائی پیدا ہوتی گئی۔
بہر حال نتیجہ یہ نکلا کہ ہم بہت جلد ایک دوسرے سے بے تکلّف ہو گئے۔ حکم ہوا "یوں
جب جی چاہے یا ضرورت ہو، آ سکتے ہو! لیکن اتوار کے دن تمھیں دفتر سے چھٹی ہوتی
ہے، لازماً صبح کا ناشتہ میرے ساتھ کرو۔"

میں نے اقرار کر لیا۔ جو لوگ دلّی کی سردیوں کو جانتے ہیں، انھیں خوب معلوم
ہے کہ مجھے اس وعدے کے ایفا میں کیا کیا مشکل پیش آئی ہوگی۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ
آندھی ہو یا طوفان، بارش ہو کہ کڑکڑاتی سردی، میں تعمیلِ حکم میں بلاناغہ ہر اتوار کو حاضر

ہوتا رہا اور اس دن عام طور پر دوپہر تک ان کے ساتھ رہتا۔

کھانے پینے میں مزاج بہت نفاست پسند تھا۔ حتی الوسع اس بات کی کوشش کرتے کہ سالن ترکاری ہاتھ سے نہ کھائیں۔ وہ برداشت نہیں کرسکتے تھے کہ چکناہٹ یا [illegible] کی زردی انگلیوں پر رہ جائے۔ اس لیے بے دریغ چمچے اور کانٹے کا استعمال کرتے تھے۔ انھیں دہی کا پنیر بہت پسند تھا۔ یعنی دہی، پتلے ململ کے ٹکڑے میں ڈال کر لٹکا دیا جاتا تھا۔ جب تمام پانی رِس کے نکل جاتا تو بقیہ پنیر دو پتھروں یا کسی اور بھاری اور سخت چیز کے درمیان رکھ کے ہموار کرلیا جاتا۔ پھر اس کے تکونے، لمبوترے، چوکور ٹکڑے کاٹ لیے جاتے۔ ناشتے میں یہ پنیر ضرور ہوتا تھا اور وہ اسے ہمیشہ کانٹے سے کھاتے تھے۔

کھانے میں مچھلی بہت پسند تھی، لیکن اُس کے کانٹے سے بہت ڈرتے تھے۔ اخیر عمر میں بینائی میں بھی فرق آ گیا تھا، چھوٹا کانٹا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس لیے عام طور پر بیگم صاحبہ ان کے لیے علاحدہ، پہلے سے کانٹا نکال کے دسترخوان پر رکھ دیا کرتی تھیں۔ خوراک بہت کم تھی۔

ایک دن ناشتے پر فرمایا "خوب پیٹ بھر کے کھالو، ممکن ہے کہ ہم لوگوں کو دوپہر کا کھانا نہ ملے۔ آج ہمیں سیر کے لیے باہر جانا ہے۔"

اب میرا یہ معمول ہوگیا تھا کہ جب وہ مجھ سے کچھ کرنے کو کہتے، تو میں کوئی حیل حجت نہیں کرتا تھا۔ وہ میری عادتوں سے خوب واقف تھے اور انھیں معلوم تھا کہ مجھے کون سی چیز پسند ہے اور کون سی ناپسند۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے کوئی ایسا کام کرنے کو نہیں کہیں گے جو میرے خلافِ طبع ہو۔ اس دن بھی یہی ہوا۔ میں نے نہیں پوچھا "کہاں کا ارادہ ہے۔" صرف اتنا کہہ دیا کہ "بہت اچھا۔" انھوں نے کسی دوست سے گاڑی مانگ رکھی تھی۔ ملازم کو حکم ہوا کہ گاڑی لے آؤ۔ ہم نیچے اُترے اور نئی دلّی کے راستے حضرت نظام الدینؒ کے مزار پر پہنچ گئے۔

میرا سلطان جی میں یہ پہلا پھیرا تھا۔ سب سے پہلے [illegible]
کے مزار مقدس پر حاضری دی۔ یہاں فاتحہ پڑھ کے ہم ادھر صحن میں [illegible]
چوکیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ چند مجاور بھی ہمارے پاس آن بیٹھے۔ وہ [illegible]
طرح جانتے تھے۔ یہ بھی ایک ایک سے اس کے گھر بار کا حال پوچھتے رہے۔ [illegible]
اندر مزار پر سے سبز کپڑے کے دو چھینٹے لے آیا۔ ایک ایک ہماری ٹوپیوں سے [illegible]
دیا گیا۔ سائل صاحب نے اس سے کچھ سلوک کیا۔ پھر مجھ سے فرمانے لگے: "[illegible]
دین کے مزاروں پر اکثر آتے رہنا چاہیے۔ اس سے برکت حاصل ہوتی ہے اور دل میں
انابت الی اللہ پیدا ہوتی ہے۔ افسوس، اب ان مقامات پر اکثر مجاور ایسے ہیں جنھوں
نے محض دکان داری بنا رکھی ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ انھی میں ایسے لوگ بھی
ہیں جن کے دل صاحب مزار کے انوار سے منوّر ہیں۔ اور اگر تم واقعی یہاں کی برکات
حاصل کرنا چاہو تو لازم ہے کہ انھیں واسطہ بناؤ۔"

پہلے تو میرے جی میں آئی کہ ان سے کٹھ حُجّتی کر بیٹھوں۔ لیکن موقع بے ڈھب تھا! ہمارے اِرد گرد بہت لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اس لیے میں نے طرح دے جانے اور خموشی ہی میں عافیت دیکھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسے پوری نہیں تو نیم رضا تو ضرور سمجھے ہوں گے۔

دیکھیے، بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ میں ذکر کر رہا تھا حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزار مقدس کا۔ تو زیارت سے مشرف ہو کر ہم باہر نکلے اور پھرتے پھراتے خواجہ حسن نظامی مرحوم کے دولت کدے پر پہنچ گئے۔ سائل صاحب اور خواجہ صاحب میں پرانی ملت تھی۔ خواجہ صاحب موجود نہیں تھے۔ ان کے بڑے صاحب زادے حسین نظامی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ تھوڑی دیر ان سے بات چیت ہوتی رہی اور چائے پانی سے کچھ تواضع بھی ہوئی۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب موصوف فاسفورس کے تیل اور

دیابین کا بہت اشتہار دے رہے تھے۔ جانے کیسے، ان چیزوں کا ذکر چل پڑا۔ حسین بھائی صاحب نے ان دونوں چیزوں کا ایک ایک نمونہ ہمیں پیش کیا اور ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے رخصت ہوئے۔

گرمیوں میں جب حکومتِ ہند کے دفتر شملے جایا کرتے تھے، تو یار لوگ یہاں کی سردی کو شعر و سخن کی گرم بازاری سے کم کرنے کی کوشش کرتے۔ چناں چہ ہر سال یہاں اچھے خاصے بڑے پیمانے پر ایک مشاعرہ منعقد ہوا کرتا تھا جس میں شرکت کے لیے ہندوستان کے مختلف حصوں سے مشاہیر کو دعوت دی جاتی تھی۔ سائلؔ صاحب بھی ان مشاعروں میں آتے تھے۔ ۱۹۳۷ء کے مشاعرے کے بعد جب وہ ہال سے نکل رہے تھے، تو کسی نومشق نے پوچھا "دلّی میں آپ کا پتا کیا ہے، جس پر آپ کی خدمت میں خط لکھا جاسکے۔" ایک دم کھڑے ہوگئے اور ہاتھ کی لکڑی کو زمین پر مارتے ہوئے چمک کے بولے "میاں صاحب زادے! خط پر صرف 'سائلؔ، دلّی' لکھ دینا، مجھے مل جائے گا۔"

اس کے باوجود طبیعت میں حد درجہ انکسار اور مروّت کا مادّہ تھا۔ کوئی ان کے پاس چلا جائے، انھیں ملنے اور اس کی فرمایش پوری کرنے سے انکار نہیں ہوتا تھا۔ کوئی صاحب تشریف لے آتے اور کلام سنانے کی فرمایش کردیتے۔ وہ اندر سے بیاض منگواتے اور شعر سنانے لگتے۔ اب جب تک وہ شخص خود یہ نہ کہہ دے "شکریہ، بس کیجیے" یا کوئی اور ذکر نہ چھڑ جائے، سائلؔ صاحب بیاض ہاتھ سے نہ رکھتے۔ اگر کوئی صاحبِ ذوق آدمی ہوتا تو خیر ایک بات بھی تھی، لیکن بعض اوقات ایسے ایسے گاودیوں سے واسطہ پڑ جاتا جو نظم اور نثر کا فرق تک نہیں جانتے تھے۔ اب جائے ماندن، نہ پائے رفتن۔ لیکن نواب صاحب بڑے اطمینان سے اسی طرح ان سے بھی پیش آتے۔ میں بہت چڑ چڑ ہوتا۔ ایک آدھ مرتبہ میں نے شکایت بھی کی کہ آخر آپ کیوں ایسے کور ذوقوں کو

"بھائی، انکار کرنے کی جرأت نہیں پڑتی کہ اس سے اس کی دل شکنی ہوگی۔ ۔
نے سنا نہیں؟ دل بدست آور کہ حج اکبراست"

ان کی زبان کی تعریف کرنا تحصیلِ حاصل ہے کہ ان کے خاندان کی زبان ہمیشہ
مستند اور ٹکسالی سمجھی گئی ہے۔ اگر اردوئے معلّیٰ کا لطف لینا ہو تو سائل کا کلام پڑھیے۔
انھوں نے بعض اوقات بہت مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے اور ان میں ایسے ایسے
شگفتہ اور پُرلطف شعر نکالے ہیں کہ یہ کچھ انھی سے ممکن تھا۔

ان کی شاعری کی عمر ساٹھ برس کے قریب تھی اور بلا مبالغہ ایک لاکھ شعر سے کم
ان کا سرمایہ نہیں ہوگا۔ لیکن ان کا بہت بڑا کارنامہ ان کی مثنوی 'نورٌ علیٰ نور' ہے جس میں
بنیادی طور پر اگرچہ نور الدین جہاں گیر بادشاہ اور ملکہ نور جہاں بیگم کی حیاتِ معاشقہ کا
بیان ہے لیکن اس میں اور بھی بیسیوں مسائل آ گئے ہیں۔ افسوس کہ نامکمل رہ گئی ورنہ
خاصے کی چیز ہوتی۔ اب بھی اس میں سات آٹھ ہزار شعر سے کم نہیں ہوگا۔

زمانے کا مذاق بدل گیا، ان کے پورے دیوان کون چھپوائے گا اور کون پڑھے گا
لیکن اگر کوئی اللہ کا بندہ چار پانچ ہزار شعر کا انتخاب ایک مجلّہ میں شایع کر دے تو یہ زبان
کی واقعی خدمت ہوگی اور مثنوی تو ضرور چھپ جانا چاہیے۔ اگرچہ وہ نامکمل ہی ہے۔

معانی و اشارات

ہاتھ پاؤں مارنا — کوشش کرنا

ایّام — یوم کی جمع، دن مراد زمانہ، دَور

عروس البلاد — شہروں میں دلہن (عروس دلہن کو کہتے ہیں اور بلاد جمع ہے بلد معنی شہر کی
خوبصورت اور بڑے شہروں کے لیے یہ ترکیب استعمال ہوتی ہے)

دانت کاٹی روٹی — بے حد دوستی، بچپن کی دوستی

- ادھ بچا پانی [illegible]

داڑھی - [illegible] کے پاس [illegible]

پیش طاق - [illegible]

سردہ - خربوزے کی ایک قسم جس کی [illegible] ہوتی ہے

لگن - طشت، پرات

[illegible] - سرخ و سفید رنگ

میدہ و شہاب کی ملی جلی رنگت

ٹھڈی - ٹھوڑی

کلّہ - جبڑا

یک مشت، دو انگشت - ایک مٹھی اور دو انگلیوں کے برابر داڑھی

شرعی لبیں - شریعت کے مطابق تراشی ہوئی مونچھیں

لٹھا - ایک قسم کا سوتی کپڑا

خورد نوک - چھوٹی نوک

آداب بجالانا - عجز و انکسار سے سلام کرنا

ٹھٹھیرا - پیتل تانبے کے برتن بنانے یا بیچنے والا

منغّض - مکدر، ناخوش

وعدہ ایفا کرنا - وعدہ پورا کرنا

نفاست پسند - صفائی پسند، پاکیزگی پسند کرنے والا

حتی الوسع - جہاں تک ہو سکے

اِنابت اِلی اللہ - اللہ سے رجوع ہونا

سلطان جی - حضرت نظام الدین اولیاؑ کے مزار اور اس کے اطراف کا علاقہ

سلوک کیا	- کچھ رقم عنایت کی
کٹھ حجتی کرنا	- بلاوجہ بحث کرنا
طرح دے جانا	- ٹال جانا، چشم پوشی کرنا، درگزر کرنا
عافیت	- امن، سلامتی، بھلائی
ملّت	- میل جول، راہ و رسم
مشاہیر	- مشہور کی جمع، نام ور لوگ
گاودی	- بے وقوف، کند ذہن، گھامڑ
جائے ماندن نہ پائے رفتن	- عموماً اس طرح بولا جاتا ہے 'جائے رفتن نہ پائے ماندن'، مراد نہ جا سکیں نہ رک سکیں
جِز بِز ہونا	- ناک بھوں چڑھانا، افسردہ ہونا، جلنا
کور ذوق	- بدذوق
طبع آزمائی	- طبیعت کی آزمائش مراد شعر گوئی

مشق و مطالعہ

(الف) ذیل کے سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

۱- مصنف پہلی مرتبہ دہلی کب آئے؟

۲- دہلی میں مصنف کے جگری دوست کون تھے؟

۳- نواب سراج الدین خاں کے مکان کی تختی پر کیا لکھا تھا؟

۴- مصنف کی ملاقات کے وقت نواب صاحب کی عمر کیا تھی؟

۵- مصنف اور نواب صاحب کو گفتگو کرنے میں کیا دِقّت پیش آئی؟

۶- نواب صاحب نے اپنے گھر کا پتا کیا بتایا؟

۷- مثنوی 'نورٌ علیٰ نور' میں کس کا تذکرہ ہے؟

مفصل جواب دیجیے۔

(ب) ۱۔ سائل دہلوی کا حلیہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۲۔ مالک رام نے سائل دہلوی کی نفاست پسندی کس طرح ظاہر کی ہے؟

۳۔ نواب صاحب کے مکان کا نقشا اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۴۔ سائل صاحب کی طبیعت میں انکسار و مروّت کن باتوں سے ظاہر ہوتی ہے؟

(ج) مندرجۂ ذیل جملوں کی سیاق وسباق کے حوالے سے تشریح کیجیے۔

۱۔ ایک نورانی صورت بزرگ داخل ہوئے۔

۲۔ افسوس اب ان مقامات پر اکثر مجاور ایسے ہیں جنھوں نے محض دکان داری بنا رکھی ہے۔

۳۔ ان کے خاندان کی زبان ہمیشہ مستند اور ٹکسالی سمجھی گئی ہے۔

(د) محاوروں کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کے مفہوم واضح ہو جائیں۔

آداب بجالانا۔ وعدہ ایفا کرنا۔ کٹ حجتی کرنا۔ طرح دے جانا۔ جز بز ہونا۔

- **آزاد اور تابع فقرے:** آپ نے دیکھا کہ مفرد جملے میں ایک ہی فعل ہوتا ہے۔ مرکب جملے میں دو یا دو سے زیادہ فعل الگ الگ فقروں میں ہوتے ہیں۔ ہر فقرہ آزاد ہوتا ہے اور ایک دوسرے کا معاون ہوتا ہے۔ کچھ جملے ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں ایک سے زیادہ فعل الگ الگ فقروں میں ہوتا ہے۔ البتہ ایک فقرہ آزاد ہوتا ہے اور دوسرا فقرہ یا دوسرے فقرے معنی کے لحاظ سے آزاد فقرے پر منحصر ہوتے ہیں یعنی آزاد فقرے سے مل کر بات پوری کرتے ہیں۔ ایسے فقروں کو 'تابع فقرے' کہتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے:

* عمران نے بتایا کہ مہابلیشور کا راستہ کون سا ہے۔
* پھر آ گئے وہیں پہ جہاں سے چلے تھے ہم
* مصرع: ''میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں''

مثال نمبر ۱ میں دو فقرے ہیں (۱) عمران نے بتایا (۲) کہ مہابلیشور کا راستہ کون سا ہے۔ پہلا فقرہ آزاد ہے اور دوسرا فقرہ تابع ہے۔ یعنی معنی کے لیے پہلے فقرے پر منحصر ہے۔ اسی طرح دوسری اور تیسری مثال میں دو فقرے ہیں جن میں ایک آزاد فقرہ اور دوسرا تابع فقرہ ہے۔

●●●

مشاہیر کے خطوط ادبی اہمیت بھی رکھتے ہیں اور تاریخی بھی۔ ذیل میں اردو
ادب کے عظیم مصنفین کے تین خطوط دیے گئے ہیں۔ پہلا خط مرزا غالب کا ہے۔
غالب کے خطوط ان کی شاعری کی طرح اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ کی حیثیت
رکھتے ہیں۔ دوسرا خط سرسیّد احمد خاں کے نام شبلی نعمانی کا ہے۔ شبلی نے مصر و روم و
شام کا سفر کیا تھا۔ ان کا یہ سفرنامہ ان کی سوانحی کتابوں اور مقالات کی طرح تاریخی
حیثیت رکھتا ہے۔ اسی سفر کے دوران انھوں نے یہ خط لکھا تھا۔ تیسرا خط اکبر الٰہ آبادی
کا ہے جو انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام لکھا ہے۔ اکبر نے مولانا کے
کلام کو دیکھ کر اس خط میں اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے۔

مرزا غالبؔ کا خط مرزا علاء الدین خاں علائی کے نام

سنو! عالم دو ہیں۔ ایک عالمِ ارواح اور ایک عالمِ آب و گل۔ حاکم ان دونوں
عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے "لِمَنِ المُلکُ الیوم" اور پھر آپ جواب دیتا ہے
"للہ الواحد القہار"۔ ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح میں
سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے
ہیں۔ چناں چہ ۸؍ رجب ۱۲۱۲ھ کو مجھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس
حوالات میں رہا۔ ۷؍ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکمِ دوامِ حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی
میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اِس زنداں میں ڈال
دیا۔ فکرِ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔

برسوں کے بعد میں جیل خانے میں سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا

پایان کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار۔ مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی۔ طاقت یک قلم زائل ہوگئی۔

بے حیا ہوں، سال گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ، مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر، بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا۔

●●●

شبلی کا خط سر سیّد احمد خاں مرحوم کے نام

(از قسطنطنیہ)

سیّدی!

تسلیم، میں ۲۲ رمئی کو یہاں پہنچا، لیکن تردّدات کی وجہ سے خط لکھنے کی مہلت نہ مل سکی، یہ خط بھی مختصر اور پرائیویٹ ہے۔ کچھ کچھ باتیں آپ انتخاب فرما کر چھاپ دیں تو ممکن ہے۔ میں نے سر دست ایک مختصر سا حجرہ کرایے کا لے لیا ہے لیکن کھانے کا صَرف یہاں بہت زیادہ ہے۔

سب سے ضروری بات یہ ہے کہ آپ دو تین سو یا اس سے زیادہ روپے بھیج دیں کہ جو کتاب جس وقت ہاتھ آئے، لے لی جائے، یا نقل و کتابت کا انتظام کیا جا سکے۔ کتابیں یہاں بہت ہیں اور نادر ہیں۔ لیکن کہاں تک لکھوائی جا سکتی ہیں؟ امام غزالی کی تصنیفیں یہاں موجود ہیں اور بوعلی سینا کی تو شاید کل تصنیفات مل سکتی ہیں۔ امام غزالی

کے خطوط بھی موجود ہیں۔ خیر وہ ممکن ہو گا کیا جائے گا۔

یہاں اکثر لوگوں سے ملاقات ہو سکتی ہے لیکن مشکل ...

کالج، مجھے مگر زبان کی اجنبیت کی وجہ سے حالات معلوم کرنے میں ...

ہے۔ میں نے ترکی پڑھنی شروع کی ہے اور انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ...

وقت تک سیکھ لوں گا۔ اس وقت تمام کالجوں وغیرہ کی رپورٹ تیار کر رہا ہوں گا۔

حالات دل چسپ ہیں اور سفرنامے کے لیے بہت سامان مل جائے گا ...

وقت بلکہ زمانۂ قیام تک مطلق فرصت نہیں مل سکتی۔ ہر روز تین چار میل ...

ہے، بہت بڑا شہر ہے اور تمام کتب خانے وغیرہ دور دور واقع ہیں۔

وہاں کے حالات جس قدر تحریر فرمایئے گا، میری تشفی کا باعث ہوگا ...

حضور کے بھروسے پر چھوڑ آیا ہوں، ہاں حمید کو نگرانی کی تاکید فرمایئے گا۔

یہ خط والد قبلہ کو بھیج دیا جائے، یا اس کی نقل۔ متعدد خطوط لکھنے کی فرصت نہیں ...

حالات سفر میں ایک قصیدہ موزوں ہو گیا ہے، وہ خط کے ساتھ شامل ہے۔ مطبع مفید ...

میں چھاپ کر علی گڑھ گزٹ کے ساتھ شائع کر دیا جائے تو مناسب ہوگا۔ اس ...

کا یہاں والد قبلہ کو بھی بھیج دیجیے گا۔

شبلی نعمانی

۲۵رمئی ۱۸۹۲ء

قسطنطنیہ، مقام تختہ خان، قریب خانۂ محمود پاشا

●●●

اکبر الہ آبادی کا خط عبدالماجد دریابادی کے نام

الہ آباد

۸ر ستمبر ۱۴ء

عزیزی وحبیبی سلمہ اللہ تعالیٰ

مجھ کو حیرت ہوئی کہ آپ ایسے شعر کہہ سکتے ہیں۔ جو رنگ سخن ظاہر ہوا ہے وہ بہت پختہ ہے۔ کیا کہنا چاہیے اور کیوں کر کہنا چاہیے۔ اول میں کوئی جگہ اعتراض کی نہیں ہے بلکہ آپ کی تقلید مناسب ہے۔ دوم میں البتہ کہیں کہیں کچھ اصلاح کی ضرورت ہے۔ بہر کیف میں آپ کی غزل دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ یہ شعر تو ہر اعتبار سے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔

رہی ہر چند عقل صبر آموز
نہ گئیں بے قراریاں نہ گئیں

کیا خوب کہا ہے۔ آپ انشاءاللہ بڑی باطنی ترقیاں حاصل کریں گے۔
کبھی دل چاہے تو دو ایک دن کے لیے چلے آیئے۔ آپ تو طالب علمانہ حالت میں ہیں اور میرے عزیز ہیں۔ سفر کا بل میرے ذمے۔ دو دن سے طبیعت اچھی نہیں، نزلے میں مبتلا ہوں۔ زیادہ نہ لکھ سکا۔

دعا گو
اکبر حسین

●●●

(۱۴)

دستک

میرزا ادیب

ولادت: وفات: ۲۰۰۵ء

میرزا ادیب اُردو کے مشہور نثر نگار ہیں۔ اُن کے کئی افسانے، یک بابی ڈرامے اور تنقیدی مضامین شایع ہو چکے ہیں۔ ان کے ڈراموں کے کچھ مجموعوں کے نام ہیں: 'آنسو اور ستارے' 'لہو اور قالین' اور 'پسِ پردہ'۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی کہانیاں اور مضامین لکھے ہیں۔ ان کا اندازِ بیان سادہ اور دل کش ہوتا ہے۔ افسانہ ہو یا ڈراما، وہ فنی باریکیوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ذیل کا ڈراما ان کے یک بابی ڈراموں کے مجموعے 'پسِ پردہ' سے لیا گیا ہے۔

اس ڈرامے میں واقعات اور مکالموں کے ذریعے ڈراما نگار نے یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ ماضی کی لغزشیں خاص حالات میں تحت الشعور سے اُبھر کر دل و دماغ پر مسلسل دستک دیتی رہتی ہیں۔ یہ دستک دراصل ضمیر کی آواز ہے۔ اس ڈرامے کا کردار 'ڈاکٹر برہان' ایک مثالی اور قابلِ تقلید کردار ہے جو حقیقتِ حال سے واقف ہو کر بھی انتقام لینے کی بجائے فرض شناسی کا ثبوت دیتا ہے۔

***

کردار:

(۱) ڈاکٹر زیدی ...... ایک ڈاکٹر

(۲) بیگم زیدی ...... ڈاکٹر زیدی کی بیوی

(۳) ڈاکٹر برہان ...... ڈاکٹر زیدی کا معالج

[ڈاکٹر زیدی کا کمرہ۔ ڈاکٹر صاحب پلنگ پر گاو تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ عمر پچپن کے لگ بھگ۔ چہرے پر نقاہت نمایاں ہے۔ ایک وقت انھوں

یا ... کون ہے۔
یکھتا ہوں، دروازے پر کوئی بھی نہیں ہے!
ہربانی کرکے بیٹھے رہیے۔ دروازے پر
یہ دستک؟
بیگم ان کے گرد کمبل لپیٹنے لگتی ہیں۔)
یز ہوا کا شور ہے۔
یز ہوا دروازے پر دستک دیا کرتی ہے؟ تم جا کر دیکھو تو ذرا۔
ں کہتی ہوں کوئی نہیں ہے۔ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں!
را سنو تو! صاف! بالکل صاف!! دستک نہیں تو اور کیا ہے؟
پ کا وہم ہے!
یکھو! اب زیادہ زور سے ہونے لگی ہے! یہ وہم ہے کیا؟
پھر اُٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بیگم اُن کا ہاتھ پکڑ لیتی ہیں)
خدا کے لیے لیٹے رہیے! آپ تو خود ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر ہو کر ایکی
کر رہے ہیں؟ اپنی حالت کا ذرا خیال کریں۔
م ایک مرتبہ جا کر دیکھ نہیں آتیں!
یں جانتی ہوں دروازے پر کوئی نہیں۔ خیر! دیکھ آتی ہوں۔
یوں سر کو جنبش دیتی ہیں جیسے اس کام کو بے کار سمجھ رہی ہیں۔ زیدی
ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے ہیں۔ بیگم پردے کے پیچھے چلی جاتی ہیں
چند لمحوں بعد پردے سے باہر آتی ہیں۔)
کون ہے؟
کون ہوگا؟

(بیگم واپس آتی ہیں۔)

زیدی : تم نے دروازہ کھولا تھا؟

بیگم : (ذرا غصے سے) تو کیا دروازہ کھولے بغیر ہی کہہ رہی ہوں! نہ جانے بیٹھے بیٹھے کیا ہو جاتا ہے آپ کو! کوئی آئے گا تو کیا کال بیل نہیں بجائے گا؟ دروازے پر دستک دے گا؟

(ڈاکٹر اور بیگم ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر کی نظروں میں بے اعتباری سی ہے اور بیگم کی نظروں میں شکایت۔)

زیدی : مگر یہ دستک!

بیگم : (بات کاٹتے ہوئے) آپ آرام نہیں کریں گے؟ ڈاکٹر ہو کر .....!

زیدی : (بیوی کی بات کاٹ کر) بار بار مجھے کیوں جتا رہی ہو کہ میں ڈاکٹر ہوں!

بیگم : وہ اس لیے کہ آپ کو عام لوگوں سے بالکل مختلف ہونا چاہیے۔ اگر ڈاکٹر بھی کسی واہمے کا شکار ہو جائے تو پھر اس کے علم کا کیا فایدہ؟

زیدی : شاید تم سچ کہتی ہو۔

بیگم : (آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے) آپ خود ہی بتایئے۔ ایک ڈاکٹر حقیقت پسند نہیں ہوگا تو اور کون ہوگا؟

زیدی : دروازے پر دستک کی آواز سننا حقیقت کے خلاف ہے؟

بیگم : جب دستک ہی نہ ہو اور اصرار کریں کہ آواز سنی ہے، اُس وقت آواز سننا کس طرح حقیقت ہوئی؟ (ڈاکٹر سر جھکا کر اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ بیگم انھیں دیکھتی رہتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی نظریں بے اختیار سامنے پردے پر پڑتی ہیں۔ تیز و تند ہوا کا شور بڑھ گیا ہے۔ شاید بارش شروع ہو گئی ہے۔)

بیگم : آپ لیٹ جائیں نا!

(ڈاکٹر صاحب اپنے خیال میں غرق ہیں۔)

زیدی : کیا کہا؟

بیگم : لیٹ جائیے!

زیدی : تم نے دروازہ کھول کر دیکھا تھا نا؟

بیگم : حد ہوگئی! آپ لیٹ کیوں نہیں جاتے؟ آدھی رات ہو چکی ہے، ابھی تک جاگ رہے ہیں۔ ڈاکٹر برہان نے کہا نہیں تھا کہ آپ کو مکمل آرام کی ضرورت ہے۔

زیدی : تو کیا یہ بات میں خود نہیں جانتا؟

بیگم : کیوں نہیں جانتے؟ جانتے ہیں اور خوب جانتے ہیں۔ ڈاکٹر برہان نے کہا تھا میں خود آ کر دوا پلاؤں گا۔ شاید یاد نہیں رہا انھیں، اب تو صبح ہی آئیں گے۔

زیدی : اچھا لڑکا ہے۔

بیگم : میں نے اتنا ذمہ دار اور فرض شناس ڈاکٹر آج تک نہیں دیکھا۔ سوائے کام کے اسے کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ ہر وقت کام! دن ہو یا رات، کام کے علاوہ کوئی غرض نہیں۔ یہ ہے فرض شناسی!

زیدی : ڈاکٹر کو فرض شناس ہی ہونا چاہیے۔

(یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب پھر سامنے پردے کو دیکھنے لگتے ہیں۔)

بیگم : آپ پھر!...... توبہ ہے! ڈاکٹر برہان آئیں گے تو کہوں گی ان سے۔

زیدی : کیا کہو گی؟

بیگم : یہ بھی تو ایک بیماری ہے۔ دروازے پر کوئی دستک نہیں اور آپ ہیں کہ دستک کی آواز سن رہے ہیں! ایک بار نہیں، کئی بار ایسا ہوا ہے۔

(دروازے پر گھنٹی بجتی ہے۔)

[illegible] آیا ہے کوئی!

شاید ڈاکٹر برہان ہیں

(بیگم [illegible] کی طرف جاتی ہیں [illegible] بیگم [illegible]

چند لمحوں بعد [illegible] نکلتی ہیں تو ان کے ساتھ ڈاکٹر برہان بھی ہوتے ہیں [illegible]

برہان عمر کے لحاظ سے بالکل نوجوان ہیں۔ ہاتھ میں ڈاکٹروں [illegible]

ہے۔ برساتی پہن رکھی ہے۔)

ڈاکٹر برہان : (دور ہی سے) السلام علیکم ڈاکٹر صاحب۔

زیدی : وعلیکم السلام۔ بڑی تکلیف کی بیٹا! اس وقت آنے کی کیا ضرورت تھی، صبح دیکھا جاتا۔

برہان : معاف کیجیے، آج شام سے پہلے دو کیس ایسے آ گئے کہ فرصت ہی نہ ملی۔ [illegible] مصروف رہا۔

(برہان آگے بڑھتے ہیں۔ بیگ چھوٹی میز پر رکھ دیتے ہیں۔)

برہان : ٹمپریچر دیکھا؟

بیگم : تھوڑی دیر پہلے سو (۱۰۰) تھا۔

برہان : سینے میں درد تو نہیں؟

زیدی : نہیں۔

برہان : شکر ہے، اور کوئی بات؟

بیگم : گھبراہٹ سی ہے۔

برہان : کوئی بات نہیں۔ میرا خیال ہے انجکشن میں ناغہ کر دیا جائے۔

زیدی : یہ ٹھیک ہے۔

(بیگم جلدی سے بائیں دروازے سے ہوتے ہوئے دوسرے کمرے میں

چلی جاتی ہیں۔ برہان ایک بوتل اُٹھاتے ہیں۔)

برہان : سیرپ ختم ہو گیا ہے۔ کل آؤں گا تو لے آؤں گا۔

زیدی : تو آپ چلے؟

برہان : جی ہاں۔

بیگم : (دوسرے کمرے سے) ڈاکٹر صاحب!

برہان : جی!

بیگم : ذرا ٹھہریے۔

برہان : مجھے جلدی ہے ذرا۔

بیگم : ایک دو منٹ۔ چائے لا رہی ہوں۔

(بیگم آتی ہیں۔ ڈاکٹر برہان کو ٹرے میں چائے پیش کرتی ہیں۔ ایک پیالی خود اٹھا لیتی ہیں۔)

زیدی : (جیسے خود سے باتیں کر رہے ہوں) اٹھارہ برس پہلے کا واقعہ ہے۔ اُس زمانے میں میری پریکٹس خوب چلتی تھی۔ سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ ڈسپنسری اور گھر پر مریضوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ایک رات میں دیر سے گھر پہنچا اور پہنچتے ہی بستر پر گر پڑا۔ بری طرح تھک چکا تھا۔ (برہان پیالی میز پر رکھ دیتے ہیں۔ بیگم پیالی ہاتھ میں لیے شوہر کو بڑے غور سے دیکھ رہی ہیں۔) کچھ دیر بعد نوکر نے آ کر بتایا کہ ایک بڑے میاں آئے ہیں اور آپ کو ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ میں نے انکار کر دیا اور نوکر سے کہا 'بڑے میاں کو واپس بھیج دو۔' مگر اس کے روکنے کے باوجود وہ بوڑھا میرے کمرے میں آ گیا اور منت سماجت کرنے لگا کہ 'میرا بیٹا سخت بیمار ہے۔ پہلے بھی آپ کی دوا سے شفا ہوئی تھی، چل کر دیکھ لیں۔' مگر میری آنکھیں بند ہوئی

جارہی تھیں۔ (زیدی دو تین لمحوں کے لیے خاموش رہتے ہیں۔ پھر کہنے لگتے ہیں۔) گرم بستر چھوڑنا بڑا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے سختی سے انکار کر دیا۔ وہ بولتا رہا اور جب نوکر نے اسے زبردستی باہر نکال دیا تو دروازے پر دستک دینے لگا۔ نہ جانے کب تک دستک دیتا رہا۔ کچھ دیر بعد میں سو گیا۔ (زیدی پھر خاموش ہو جاتے ہیں۔ بیگم کی نگاہیں اپنے شوہر پر جمی ہوئی ہیں اور برہان میز سے دوائی کی ایک شیشی اُٹھا کر اُسے دیکھ رہے ہیں۔) صبح اُٹھا تو طبیعت پر بڑا بوجھ تھا۔ افسوس کر رہا تھا کہ میں نے بوڑھے کو کیوں مایوس کیا۔

برہان : اُس وقت آپ کا ضمیر بیدار ہو گیا تھا۔

زیدی : بس یہی بات تھی۔ میں نے اس بوڑھے کو ڈھونڈنے کی کوشش بھی کی مگر کہیں پتا نہ چلا۔ نہ جانے وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا۔

برہان : وہ بوڑھا تو چلا گیا۔ مگر اب بھی آپ کا ضمیر دروازے پر دستک دیتا رہتا ہے۔ (بوتل میز پر سے اٹھاتے ہوئے) یہ دوا آج ختم ہو جانی چاہیے تھی۔ (زیدی خاموش رہتے ہیں۔ برہان برساتی اُٹھا کر پہن لیتے ہیں اور بیگ اُٹھا کر زیدی کی طرف دیکھتے ہیں۔) ڈاکٹر صاحب!

زیدی : کہو بیٹا!

برہان : اس واقعے میں ایک بات کا اضافہ کر لیجیے۔ میں انھیں بڑے میاں کا پوتا ہوں جن کا بیٹا اُس رات ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہا تھا۔

زیدی : تم!

بیگم : برہان بیٹا!

برہان : اچھا، خدا حافظ۔ ڈاکٹر صاحب اطمینان سے سو جایئے۔ اب دروازے پر

دستک نہیں ہونی چاہیے۔ آرام کیجیے۔ شب بخیر۔ کل حاضر ہوں گا۔
(برہان دروازے کی طرف بڑھتے ہیں اور جلدی سے پردے کے پیچھے غایب ہوجاتے ہیں۔ زیدی اور بیگم انھیں خاموشی سے دیکھتے رہتے ہیں۔ برہان کے پردے کے پیچھے جاتے ہی اسٹیج کا پردہ گرتا ہے۔)

معانی و اشارات

نقاہت	–	کمزوری
وہم	–	بے بنیاد گمان، غلط احساس
ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا	–	مسلسل دیکھتے رہنا
واہمہ	–	غلط یا بے بنیاد خیال یا عقیدہ
اصرار کرنا	–	کسی بات کے لیے زور دینا
فرض شناس	–	فرض کا احساس رکھ کے اسے پورا کرنے والا
پریکٹس خوب چلتی تھی	–	مراد دواخانے میں مریض کافی آتے تھے
منت سماجت کرنا	–	بہت عاجزی کے ساتھ اصرار اور درخواست کرنا
ضمیر بیدار ہونا	–	احساس جاگ اُٹھنا
ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا	–	بہت تکلیف اُٹھاتے ہوئے مرنا

اس سبق میں انگریزی الفاظ استعمال ہوئے ہیں، مثلاً

Syrup	–	خوش ذایقہ سیال دوا، شربت
Practice	–	مراد ڈاکٹر کا کام
Dispensary	–	دواخانہ

[illegible]

Temperature — اعلیٰ درجہ حرارت

مشق و مطالعہ

(الف) ایک یا دو جملوں میں جواب دیجیے۔

۱۔ ڈاکٹر زیدی کس وہم میں مبتلا تھے؟

۲۔ بیگم زیدی ڈاکٹر کو کس طرح سمجھاتی ہیں؟

۳۔ ڈاکٹر برہان نے ڈاکٹر زیدی کے وہم کو کیا کہہ کر دور کیا؟

(ب) مفصل جواب دیجیے۔

۱۔ ڈاکٹر زیدی کے وہم کا سبب کیا تھا؟

۲۔ ڈرامے کے مرکزی خیال پر روشنی ڈالیے۔

(ج) مندرجۂ ذیل بیانات کی تشریح کیجیے۔

۱۔ ڈاکٹر بھی تو آخر انسان ہوتا ہے۔

۲۔ مگر اب بھی آپ کا ضمیر دروازے پر دستک دیتا رہتا ہے۔

(د) (۱) جملوں میں استعمال کیجیے۔

واہمے کا شکار ہونا، حقیقت پسند، تانتا بندھا رہنا۔

(۲) ذیل کے جملے غور سے پڑھیے۔

۱۔ بار بار مجھے کیوں جتا رہی ہو (کہ) میں ڈاکٹر ہوں۔

۲۔ ڈاکٹر برہان نے کہا تھا (کہ) میں خود آ کر دوا پلاؤں گا۔

۳۔ میں جانتا ہوں (کہ) انسانی فطرت بڑی پُراسرار ہوتی ہے۔

۴۔ ہوسکتا ہے (کہ) کسی نے دروازے پر دستک دی ہو۔

مذکورہ بالا جملے مخلوط ہیں۔ ان میں خط کشیدہ فقرے تابع فقرے ہیں۔ پہلے جملے کا خاص فقرہ ہے۔ (۱) بار بار مجھے کیوں جتا رہی ہو۔ اور تابع فقرہ ہے (۲) میں ڈاکٹر ہوں۔

یہ تابع فقرہ خاص فقرے کے فعل کا مفعول ہے یعنی مفعولی فقرہ ہے۔

اسی طرح دوسرے، تیسرے اور چوتھے جملوں میں خط کشیدہ فقرہ خاص فقرے کے فعل کا مفعول ہے۔ یہ فقرے چوں کہ "اسم" کا کام دیتے ہیں اس لیے "اسمیہ فقرے" کہلاتے ہیں۔ اسی تابع فقروں سے قبل لفظ 'کہ' کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ اسے 'کاف بیانیہ' کہتے ہیں۔ کبھی کبھی کاف بیانیہ محذوف بھی کر دیتے ہیں۔ اوپر کے جملوں میں کاف بیانیہ 'کہ' قوسین میں رکھا گیا ہے، یہ بتانے کے لیے کہ اسے حذف بھی کیا جا سکتا ہے۔

(۳) بعض مخلوط جملوں میں تابع فقرہ، صفت کا کام بھی کرتا ہے اس لیے اسے توصیفی فقرہ کہتے ہیں۔ یہ جملہ دیکھیے: میں ان بڑے میاں کا بیٹا ہوں جن کا بیٹا اس رات بیمار تھا۔

اس جملے میں فقرہ 'جن کا بیٹا بیمار تھا' پہلے خاص فقرے میں شامل 'بڑے میاں' کے متعلق ہے۔ یہ فقرہ صفت کا کام کرتا ہے چنانچہ یہ توصیفی فقرہ ہے۔

یہ مخلوط جملے دیکھیے:

* انھوں نے کمبل لپیٹ رکھا ہے جو خالص اون کا بنا ہوا ہے۔
* ایک بڑے میاں آئے ہیں جو آپ کو لے جانا چاہتے ہیں۔

ان میں خط کشیدہ فقرے توصیفی ہیں۔

(۴) بعض مخلوط جملوں میں تابع فقرہ متعلق فعل کا کام کرتا ہے۔

مثلاً: صبح جب اذان ہوتی ہے میں بستر سے اُٹھ بیٹھتا ہوں۔

یہاں خاص فقرہ ہے 'میں بستر سے اُٹھ بیٹھتا ہوں' اور خط کشیدہ تابع فقرہ بستر سے اُٹھنے کا وقت بتاتا ہے اس لیے متعلق فعل کا کام کرتا ہے۔ متعلق فعل کا کام کرنے والے فقرے کو ہم سہولت کی خاطر وضاحتی فقرہ کہہ سکتے ہیں۔ وضاحتی فقرہ زمان، مکان، سبب، مقصد اور کیفیت کا اظہار کرتا ہے۔

اس طرح مخلوط جملے میں خاص فقرہ کے علاوہ تابع فقرہ ہوتا ہے جو اسمیہ، توصیفی یا وضاحتی ہوتا ہے۔

●●●

گِدھ

محمد خلیل

محمد خلیل جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے وابستہ ہیں۔ [illegible]
ماحولیاتی مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے گدھوں کی [illegible]
کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور گدھ کو ایک صفائی کرنے والا پرندہ بتایا ہے۔
[illegible] کے ختم ہونے سے ہمارے ماحول کی آلودگی کو دور کرنے والے ایک [illegible] کی
کمی ہو جائے گی لہٰذا ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ ہم گدھ اور اس دنیا میں بسنے والے
دوسرے چرندوں پرندوں کو بھی جینے کا حق دیں۔

قدرت نے ایسے کئی پرندے اور جانور پیدا کیے ہیں جو ماحول کو صاف ستھرا رکھنے
کے ذمے دار ہیں کیونکہ وہ بہت سی سڑی گلی چیزوں کو اپنی غذا کے طور پر کھا جاتے ہیں۔
ایسے صفائی کرنے والے پرندوں اور جانوروں کی موجودگی صحت مند ماحول کو بنائے
رکھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ گِدھ کی شہرت بھی صفائی کرنے والے پرندے کے
طور پر رہی ہے مگر اب ان کی تعداد دن بدن کم ہوتی جارہی ہے اور ماحول کو آلودگی سے
پاک رکھنے میں دشواری پیش آرہی ہے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ دیہی علاقوں اور قصبوں میں
مرے ہوئے جانوروں کو رہائشی علاقے سے دور پھینک دیا جاتا تھا جہاں تھوڑی ہی دیر
بعد ان کو کھانے کے لیے سیکڑوں کی تعداد میں گِدھ آ پہنچتے تھے۔ لیکن آج یہ لاشیں
ہفتوں تک پڑی رہتی ہیں جس سے علاقے میں گندگی اور بدبو پھیل جاتی ہے۔ شہری
علاقوں کی حالت بھی نازک ہوتی جارہی ہے۔ مردہ جانوروں کے پڑے رہنے سے شہری
علاقے بھی آلودگی کے مسائل سے دوچار ہو رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آخر گدھوں کی تعداد میں کمی کی وجہ سے واقع ہوئی؟
ماہرین کے مطابق اس کی ایک بڑی وجہ شہری علاقوں کا تیزی سے پھیلنا اور
صنعتوں کے بڑھنے سے ہوا ہے۔ صنعتوں اور بستیوں کو بسانے سے جنگلات ختم
کیے جا رہے ہیں اور جنگلاتی علاقے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ گدھ بڑے
بڑے درختوں پر اپنے گھونسلے بناتے ہیں اور وہیں اپنے بچے پیدا کرتے ہیں۔ جنگل ان کی
قدرتی رہائش ہے لیکن جنگلوں کے اُجڑنے سے ان کے ٹھکانے بھی اُجڑ گئے اور ان کی
تعداد میں کمی آ گئی۔ اسی طرح اچانک نمودار ہونے والی آفات اور ان سے پیدا ہونے والی
بیماریوں سے بھی گدھوں کی تعداد میں کمی آئی ہے۔ اس کے علاوہ آج ساری دنیا میں
فصلوں کو بچانے کے لیے کیمیائی کیڑے مار دواؤں کا استعمال بڑے پیمانے پر ہو رہا
ہے۔ ماہرین ماحولیات اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کیمیائی کیڑے مار دواؤں کے زہریلے پن
کی وجہ سے بھی گدھوں کی تعداد عالمی سطح پر کم ہوئی ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ جانوروں میں درد کو کم کرنے کے لیے علاج کے دوران
استعمال کی جانے والی ایک عام دوا ڈیکلو فینک گِدھوں کی موت کی بڑی حد تک ذمے دار
ہے کیوں کہ اس دوا کے اجزا مرے ہوئے جانوروں کے گوشت سے گِدھوں کے جسم
میں پہنچتے ہیں جس سے وہ مر جاتے ہیں۔

ماہرین نے سب سے پہلے گِدھوں کے ذریعے کھائی جانے والی مختلف چیزوں کی
جانچ کی تو انھیں پتا چلا کہ ان میں موجود زہریلے مادوں کے سبب گِدھ مختلف امراض کا
شکار ہوئے ہیں۔ مثلاً متعدد گِدھوں کی گردن جھکی ہوئی تھی جس سے ان کی اندرونی
کمزوری/ گھبراہٹ کا انکشاف ہوتا تھا۔ ماہرین نے یہ بھی دیکھا کہ نسل کو بڑھانے کے موسم میں
بہت سے گدھ گھونسلے تک نہیں بناتے تھے اور جو گھونسلے بنا لیتے تھے وہ ان میں انڈے
نہیں دیتے تھے۔ اس طرح ان کی تعداد میں کمی آئی ہے۔ کچھ گدھوں کی طبّی جانچ کے

[illegible]

ہے ... [illegible] ... چنانچہ سائنس سے مدد لی جا رہی ہے۔

یہ جاننا بھی خالی نہ ہوگا کہ کولکاتا میں دس سال قبل گدھوں کی تعداد میں دو ہزار [illegible] آسمان میں دور تک اڑتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ان کی صحیح تعداد البتہ معلوم نہیں ہے۔ اس کے بعد گذشتہ کئی سال پہلے بھی کولکاتا کے مشرقی علاقے میں جہاں کوڑے کرکٹ کا انبار ہوتا ہے، سیکڑوں گدھ نظر آتے تھے لیکن اب تو اتفاقیہ طور پر ہی کوئی گدھ نظر آتا ہے۔ جائزے سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ سرسبز علاقوں میں بھی ان کی تعداد تیزی سے کم ہو رہی ہے۔ ماہرین ماحولیات نے گدھوں کی تعداد تقریباً دو سو سے زیادہ بتائی ہے جس میں کولکاتا شہر کے پچاس گدھ بھی شامل ہیں۔

اسی طرح بھرت پور کے قریب بیانہ (راجستھان) کا شمار دنیا کے سب سے زیادہ گدھ پائے جانے والے علاقوں میں ہوتا ہے لیکن آج وہاں بھی گدھوں کی تعداد بہت کم ہے۔ راجستھان کے بارمیر علاقے میں تو گدھ باقی ہی نہیں بچے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ پچھلے کچھ برسوں میں مسلسل ان کا شکار ہوتا رہا ہے۔ ان کو مار کر ان کے جسم کے بعض حصوں سے مقوی دوائیں تیار کی جاتی ہیں۔

آندھرا پردیش کے ایک قصبے 'پٹاپا' میں رہنے والے آدی واسیوں کی مرغوب غذا گدھ کا گوشت ہے۔ جنوبی ہندوستان کے کئی اور علاقوں کے قبائلی لوگ بھی اس کا

111

گوشت کھانا پسند کرتے ہیں۔ ان وجوہات سے بھی ان کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ اس کے
علاوہ مدھیہ پردیش کے 'جھابوا' نامی علاقے کے لوگ غذا کی کمی کے باعث گدھ کو
کھاتے ہیں اور اس کے کچھ حصوں سے مقوی دوا بھی تیار کرتے ہیں۔ گدھ کا
استعمال جادو ٹونے میں بھی کرتے ہیں۔ بعض اوقات غیر قانونی طور پر گدھوں کو ہلاک
کرنے کے بعد ان کی لاشوں کو دوسرے ممالک میں فروخت کیا جاتا ہے۔ ان سب
باتوں کی وجہ سے گِدھوں کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔

گِدھوں کی تعداد جس تیزی کے ساتھ کم ہو رہی ہے اس سے یہ خدشہ پیدا ہو گیا
ہے کہ ان کو بچانے کی کوشش میں مزید تاخیر نہ ہو جائے اور ہمارے ماحولیات کا توازن
قایم رکھنے والا گدھ دنیا سے ہمیشہ کے لیے ختم نہ ہو جائے۔

گدھ ماحول کو صاف رکھنے میں انسان کا سب سے بڑا مددگار ہے۔ اگر ہم اس
کی زندگی پر غور کریں تو اسے سیدھا اور رحم دل پرندہ پائیں گے لیکن انسان کی غلطیوں
سے گِدھوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کے تحفظ کے لیے ٹھوس
اقدامات کیے جائیں۔

معانی و اشارات

آلودگی	–	ہوا، پانی، ماحول میں نقصان دہ مادّوں کا بڑھ جانا
ماہرینِ ماحولیات	–	ماحول کی آلودگی کی وجہ اور اثرات معلوم کرنے والے سائنس داں
صنعت	–	چیزیں بنانے کا کام، کارخانہ
انکشاف ہونا	–	پوشیدہ بات کا معلوم ہونا
نسل کُشی	–	نسل کو ختم کرنا (کُشتن یعنی مارنا)
تحقیق	–	کھوج، اصل حقیقت یا وجہ ڈھونڈنے کا عمل

افزائشِ نسل - نسل کی پرورش کرنے/نسل بڑھانے کا عمل

اتفاقیہ - اچانک یا اتفاق سے ہونے والا

ماحولیات کا توازن - ماحول میں قدرتی عناصر ہوا، پانی، مٹی نباتات کا موزوں تناسب

تحفظ (تَ حَف فُظ) - حفاظت، بچاؤ

اقدامات - اقدام کی جمع، قدم اُٹھانا

مشق و مطالعہ

(الف) ایک یا دو جملوں میں جواب دیجیے۔

۱- گِدھوں کی شہرت کس بنا پر ہے؟

۲- گِدھ کہاں بسیرا کرتے ہیں؟

۳- فصلوں کی حفاظت کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جاتی ہیں؟

۴- کس دوا سے گِدھوں کے گردے ناکارہ ہوجاتے ہیں؟

۵- سب سے زیادہ گِدھ کہاں پائے جاتے ہیں؟

۶- گِدھ کن لوگوں کی مرغوب غذا ہے؟

۷- گِدھ انسان کا بڑا دوست کیسے ہے؟

(ب) مندرجۂ ذیل سوالوں کے مفصل جواب دیجیے۔

۱- گِدھوں کی تعداد کم ہونے کے اسباب کیا ہیں؟

۲- گِدھوں کی کمی سے ماحول پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں؟

۳- صنعتی ترقی سے گِدھوں کی زندگی کس طرح متاثر ہوتی ہے؟

۴- سائنسی ترقی سے ماحول کیسے آلودہ ہوتا ہے؟

۵- گِدھوں کی تعداد کو بڑھانے کے لیے کیا کوششیں کی جا رہی ہیں؟

۶- ہندوستان کے مختلف خطوں میں گِدھوں کی زندگی کو کون سے خطرات درپیش ہیں؟

(ج) سیاق و سباق کے حوالے سے مندرجۂ ذیل بیانات کی وضاحت کیجیے۔

۱۔ جنگلوں کے اُجڑنے سے اُن کے ٹھکانے بھی اُجڑ گئے۔

۲۔ سرسبز علاقوں میں بھی ان کی تعداد تیزی سے کم ہو رہی ہے۔

۳۔ اگر ہم اس کی زندگی پر غور کریں تو اسے سیدھا اور رحم دل پرندہ پائیں گے۔

(د) قومی پرندہ 'مور' پر دس سطریں تحریر کیجیے۔

• اکثر دو لفظوں سے مل کر کوئی نیا لفظ بنتا ہے۔ آپس میں ملنے والے یہ دونوں الفاظ اجزائے کلام کے اعتبار سے مختلف بھی ہو سکتے ہیں اور ایک جیسے بھی۔ مثلاً دونوں اسم ہوں یا ایک اسم ہو اور دوسرا صفت۔ ایسی مختلف ترکیبیں ہو سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر: گل بدن، انسان دوست، شاہ زادہ، جواں سال، کوہ کن، شیر افگن، زرخرید، نمک حلال، راہ گیر۔

ایسے دو لفظوں سے بننے والے نئے لفظ کو مرکب لفظ کہتے ہیں۔

بعض الفاظ کے شروع میں یا آخر میں کوئی جز لگا کر نئے الفاظ بنائے گئے ہیں۔ جیسے:

الف		ب	
لاثانی	(لا + ثانی)	خطرناک	(خطر + ناک)
بے باک	(بے + باک)	گل دان	(گل + دان)
ہم سخن	(ہم + سخن)	عقل مند	(عقل + مند)
بااصول	(با + اصول)	غم گین	(غم + گین)
خوش مزاج	(خوش + مزاج)	دانش کدہ	(دانش + کدہ)
نامراد	(نا + مراد)	فتح یاب	(فتح + یاب)
		نگہبان	(نگہ + بان)
		عیدگاہ	(عید + گاہ)

حصہ الف کے الفاظ میں شروع میں کسی جز کا اضافہ کر کے نئے الفاظ بنا لیے گئے ہیں۔

حصہ ب کے الفاظ میں نئے لفظ بنانے کے لیے کسی جز کا اضافہ آخر میں کیا گیا ہے۔

کسی لفظ کے شروع میں لگائے جانے والے جز کو 'سابقہ' اور آخر میں

ولادت: ۱۸۹۱ء وفات: ۱۹۵۷ء

مولوی یوسف عزیز کا اصلی نام محمد یوسف تھا۔ اُن کے والد حاجی محمد قائم ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہجرت کر کے پہلے بھیونڈی پہنچے اور اس کے بعد مالیگاؤں میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ۱۸۹۱ء میں محمد یوسف پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے لیے انھیں مدرسہ بیت العلوم میں داخل کر دیا گیا۔ عربی اور فارسی میں اسناد حاصل کرنے کے بعد وہ اسی مدرسے میں درس و تدریس کے فرایض انجام دینے لگے۔ وہ فارسی کے نام ور استاد تصوّر کیے جاتے تھے۔

ذیل کی حمد میں شاعر نے مختلف پیرائے میں اللہ تعالیٰ کی تعریف و ثنا بیان کی ہے۔ پہلے دو شعروں میں اُنھوں نے قرآنی آیات کے حوالے سے خدا کے خالقِ کائنات ہونے اور دِکھائی نہ دینے کے باوجود ہر جگہ موجود ہونے کو بیان کیا ہے۔ پھر تین شعروں میں فطری عناصر کے واسطے سے خدا کی قدرت اور کاری گری کی داد دی ہے۔ چھٹے شعر میں انسانوں کو راہ دکھانے اور گنہ گاروں کی شفاعت کرنے والے پیغمبرِ اسلامؐ کی رسالت کو انسانیت پر احسانِ عظیم بتا کر خدا کا شکر ادا کیا ہے اور مقطع میں دعا مانگی ہے کہ ان کی شاعری کو قبولِ عام حاصل ہو۔

خداوندا کیے اک کُن سے پیدا دو جہاں تو نے
زمیں تو نے، زماں تو نے، مکیں تو نے، مکاں تو نے

بنا کر 'نحن اقرب' چھپ رہا ہے لامکاں میں
نہ بتلایا کسی کو اپنا یہ رازِ نہاں تو نے

بہارِ عالمِ امکاں ہے تیرے ابرِ رحمت سے
دکھائیں گلشنِ ایجاد میں نیرنگیاں تو نے

چمن کو تازگی دے دی، گُلوں کو رنگ و بو بخشا
رکھی ہے بُلبلوں کے لب پہ گل کی داستاں تو نے

کسے محروم رکھا تو نے اپنے فیضِ بخشش سے
اگر نرگس کو آنکھیں دیں تو سوسن کو زباں تو نے

گنہ گاروں پہ یا رب کس قدر احسان ہے تیرا
اُتارا آسمانوں سے شفیعِ عاصیاں تو نے

قبولِ جاوداں ہو ایسی تاثیرِ بیاں بھی دے
عزیزِ ناتواں کو دی ہے جب یا رب زباں تو نے

معانی و اشارات

- قرآن میں سورۂ یاسین کی آخری سے پہلی آیت کے مطابق "اللہ جب چاہتا ہے کہ کچھ تخلیق کرے تو وہ کہتا ہے 'ہو جا' پس وہ چیز ہو جاتی ہے۔" (اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنَ)
- دنیا و آخرت

[illegible] – قرآن مجید کی ایک آیت کا ٹکڑا۔ پوری آیت اس طرح ہے: نحن اقرب الیہ من حبل الورید [illegible]
قریب ہیں

[illegible] – چھپا ہوا راز

[illegible]ہاں – دنیا

[illegible]کون – مراد دنیا

گلشن ایجاد – نیرنگی کی جمع ، حیرت میں ڈالنے والی یا رنگا رنگ بات یا چیز مراد مظاہرِ فطرت کی رنگا رنگی

نیرنگیاں – آنکھ سے ملتی جلتی شکل کا ایک پھول

نرگس – سیوتی جس کا پتا زبان کی طرح ہوتا ہے

سوسن – گنہ گار۔ جمع : عاصیاں

عاصی – گنہ گاروں کی شفاعت یا سفارش کرنے والے مراد حضرت محمدؐ

شفیع عاصیاں – ہمیشہ باقی رہنے والا ، اَمَر

جاوداں

مشق و مطالعہ

(الف) ایک یا دو جملوں میں جواب دیجیے۔

۱- جہاں کس طرح وجود میں آیا؟

۲- خدا نے نرگس اور سوسن کو کیا بخشا؟

۳- شاعر نے اپنے لیے خدا سے کیا دعا کی ہے؟

(ب) اِس شعر کا مطلب بیان کیجیے:

گنہگاروں پہ یا رب کس قدر احساں ہے تیرا
اُتارا آسمانوں سے شفیعِ عاصیاں تو نے

●●●

خیر البشرؐ

(نعت)

ماہر القادری

وفات ۱۹۷۸ء

ماہر القادری کا اصلی نام منظور حسین صدیقی تھا۔ وہ کیسر کلاں ضلع ... میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد معشوق علی ظریف بھی ایک خوش فکر شاعر تھے اور تربیت نے ماہر القادری کو بچپن ہی سے شعر گوئی کی طرف مائل ... میں تلاش روزگار میں حیدرآباد دکن پہنچے لیکن تحصیل علم اور مطالعہ کی ... نہیں ہوئے۔ حیدرآباد کی علمی و ادبی فضا، تحقیق و جستجو کا ذاتی شوق، ... اور مشاہیر کی صحبتوں نے اُن کی شخصیت کو جامع الکمالات بنادیا۔

... القادری ایک رومان پسند اور نیچرل شاعر کی حیثیت سے علمی و ادبی اُفق پر ... اور زبان کی صفائی وسلاست، تراکیب کی چستی اور فکری بلندپروازی کے ... علمی و ادبی دنیا میں مشہور ہوگئے۔

... کے زمانے میں انھوں نے مشہورِ زمانہ نعتیہ نظم 'ظہورِ قدسی' ... جس نے بے کسوں کی دستگیری کی) کہی۔ اردو دنیا میں اس نظم کو بے پناہ ... ہوئی۔ مولانا ماہر القادری ایک عرصے تک ماہنامہ 'فاران' نکالتے رہے ... پر مولانا کے بے لاگ تبصرے ہر طبقے میں مقبول تھے۔

... نعتیہ اشعار اُن کی ایک طویل نظم سے ماخوذ ہیں۔ ان شعروں میں ... حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آں حضورؐ کی آمد کے وقت دنیا گم راہی ... آپ کی آمد سے نقشا بدل گیا۔ آپ کا لایا ہوا دین کئی رسولوں کی ... کی تکمیل کرنے والا ثابت ہوا۔ آخری شعر میں آں حضورؐ کو ... کا مداوا کرنے والا آخری نبی اور خیر البشر کہہ کر آپؐ کی ذاتِ اقدس ... ت پیش کیا ہے۔

ولادت: ۱۹۰۷ء

وفات ۱۹۷۸ء

مولانا ماہر القادری کا اصلی نام منظور حسین صدیقی تھا۔ وہ لیمر کلاں ضلع بلندشہر یوپی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد معشوق علی ظریف بھی ایک خوش فکر شاعر تھے۔ والد کی صحبت اور تربیت نے ماہر القادری کو بچپن ہی سے شعرگوئی کی طرف مائل کر دیا۔ نوجوانی میں تلاشِ روزگار میں حیدرآباد دکن پہنچے لیکن تحصیل علم اور مطالعہ کی طرف سے غافل نہیں ہوئے۔ حیدرآباد کی علمی و ادبی فضا، تحقیق و جستجو کا ذاتی شوق، وسعتِ مطالعہ اور مشاہیر کی صحبتوں نے اُن کی شخصیت کو جامع الکمالات بنادیا۔

ماہر القادری ایک رومان پسند اور نیچرل شاعر کی حیثیت سے علمی و ادبی اُفق پر نمودار ہوئے اور زبان کی صفائی وسلاست، تراکیب کی چستی اور فکری بلند پروازی کے سبب جلد ہی علمی و ادبی دنیا میں مشہور ہو گئے۔

حیدرآباد کے قیام کے زمانے میں انھوں نے مشہورِ زمانہ نعتیہ نظم 'ظہورِ قدسی' (سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی) کہی۔ اردو دنیا میں اس نظم کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ مولانا ماہر القادری ایک عرصے تک ماہنامہ 'فاران' نکالتے رہے جس میں نئی کتابوں پر مولانا کے بے لاگ تبصرے ہر طبقے میں مقبول تھے۔

ذیل کے نعتیہ اشعار اُن کی ایک طویل نظم سے ماخوذ ہیں۔ ان شعروں میں اُنھوں نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آں حضورؐ کی آمد کے وقت دنیا گم راہی کا شکار ہوگئی تھی اور آپ کی آمد سے نقشا بدل گیا۔ آپ کا لایا ہوا دین کئی رسولوں کی تعلیمات و ہدایات کی تکمیل کرنے والا ثابت ہوا۔ آخری شعر میں آں حضورؐ کو انسانوں کے دُکھوں کا مداوا کرنے والا آخری نبی اور خیر البشر کہہ کر آپؐ کی ذاتِ اقدس کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

زمانے کی فضا میں انقلابِ آذری آیا
نچھاور کر دیا قدرت نے سب فطرت کا سرمایا

وہ آئے جن کے آنے کی زمانے کو ضرورت تھی
وہ آئے جن کی آمد کے لیے بے چین فطرت تھی

وہ آئے جن کی خاطر مضطرب تھی وادیٔ بطحا
وہ آئے جن کے قدموں کے لیے کعبہ ترستا تھا

وہ آئے نغمۂ داؤد میں جن کا ترانہ تھا
وہ آئے گریۂ یعقوب میں جن کا فسانہ تھا

وہ آئے جن کی ٹھوکر پر نچھاور سطوتِ دارا
وہ آئے جن کے آگے سرد ہر باطل کا انگارا

وہ آئے جن کو دنیا نے شبِ غم کی سحر مانا
وہ آئے جن کو ختم الانبیا، خیر البشر مانا

معانی واشارات

سرمایا — سرمایہ، قافیے کی مناسبت سے 'سرمایا' لکھا گیا ہے

ازل — مخلوق کی پیدائش کا دن، آغاز

نغمۂ داؤد — حضرت داؤد علیہ السلام (جن پر کتابِ زبور نازل ہوئی) بہت خوش الحان تھے اور بانسری بھی بجاتے تھے

گریۂ یعقوبؑ – حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹے حضرت یوسفؑ کی یاد میں رو [illegible]

مضطرب تھی وادیٔ بطحا – مکہ اور اس کے اطراف کے لوگ قدیم صحیفوں کی پیشین گوئی [illegible] کی بتائی ہوئی نشانیوں کی روشنی میں ایک پیغمبر کی آمد سے [illegible] منتظر تھے

سِطوت – دبدبہ، رعب

دارا – ایران کا مشہور بادشاہ

ختم الانبیاءؐ – نبیوں میں سب سے آخری نبی مراد آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جن پر نبوّت ختم ہوئی

خیر البشرؐ – انسانوں میں سب سے برتر مراد آں حضورؐ جو سارے انسانوں کے لیے خیر و برکت بن کر آئے

مشق و مطالعہ

(الف) مندرجۂ ذیل سوالوں کے جواب دیجیے۔

۱- زمانے کی فضا میں آخری انقلاب آنے سے کیا مراد ہے؟

۲- حضور اکرمؐ دنیا کی کس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے تشریف لائے؟

۳- اِس نعت میں استعمال ہونے والی تلمیحات لکھیے۔

۴- نعت کے کس شعر میں تجنیس تضاد کا استعمال ہوا ہے؟

۵- اس نظم کا خلاصہ لکھیے۔

(ب) درج ذیل الفاظ کی ضدیں بتائیے۔

گریہ۔ باطل۔ مضطرب۔ سحر۔

●●●

بزمِ انجم

علامہ اقبالؔ

ولادت: ۱۸۷۷ء
وفات: ۱۹۳۸ء

شیخ محمد اقبالؔ پنجاب کے مشہور شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ انھیں علم و ادب سے بچپن ہی سے خاص لگاؤ تھا۔ ذہانت و جودتِ طبع اور شمس العلما سیّد میر حسن جیسے فاضل استاد کی رہنمائی نے ان کے علمی ذوق کو جِلا بخشی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے کی تعلیم کے دوران پروفیسر آرنلڈ نے ان کی رہبری کی۔ ہندوستان میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اُنھوں نے برطانیہ اور جرمنی میں بھی اعلا تعلیم حاصل کی۔

اقبالؔ یورپ سے بیرسٹری کا امتحان کامیاب کرکے ہندوستان لوٹے لیکن وکالت اُن کو راس نہ آئی۔ اُنھیں تو عظیم شاعر ہونا تھا۔ وہ بنی نوع آدم کو تعمیری طرزِ فکر و عمل اور اہلِ وطن کو آزادی کا پیغام دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے اشعار سے اہلِ دنیا میں حرکت و عمل کی جوت جگادی۔

'بانگِ درا' 'بالِ جبریل' 'ضربِ کلیم' اور 'ارمغانِ حجاز' انِ کے مشہور مجموعہ کلام ہیں۔ ذیل کی نظم میں اقبالؔ نے تاروں کے حوالے سے قوم کو آپسی میل محبت اور اتحاد و اتفاق سے رہنے کا درس دیا ہے۔

----------*

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو
طشتِ اُفق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور
قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اُتارے

محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی
چمکے عروسِ شب کے وہ موتی پیارے پیارے
وہ دور رہنے والے ہنگامۂ جہاں سے
کہتا ہے جن کو انساں اپنی زباں میں تارے
محوِ فلک فروزی تھی انجمن فلک کی
عرشِ بریں سے آئی آواز اک ملک کی

"اے شب کے پاسبانو! اے آسماں کے تارو!
تابندہ قوم ساری گردوں نشیں تمھاری
چھیڑو سرود ایسا جاگ اٹھیں سونے والے
رہبر ہے قافلوں کی تابِ جبیں تمھاری
آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں
شاید سنیں صدائیں اہلِ زمیں تمھاری"

رخصت ہوئی خموشی تاروں بھری فضا سے
وسعت تھی آسماں کی معمور اس نوا سے

"حسنِ ازل ہے پیدا تاروں کی دلبری میں
جس طرح عکسِ گل ہو شبنم کی آرسی میں
آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں
یہ کاروانِ ہستی ہے تیزگام ایسا
قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں

ہے ہیں ہماری قافلے ہزاروں انجم
بھی لیکن اپنی برادری میں
"... سمجھے اس کو زمین والے
میں نہ ... ہم تھوڑی سی زندگی میں"

ہیں جذب باہمی سے قایم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

معانی و اشارات

... – جُبّہ، سامنے سے کھلا گھٹنوں سے لمبا کوٹ

... سیہ قبا – سیاہ قبا میں ملبوس شام، شام کے اندھیرے کو اس کی قبا کہا ہے

...ت – تھال

محمل – اونٹ کی پیٹھ پر باندھا جانے والا کجاوہ۔ کہا جاتا ہے کہ قیس (مجنوں) نے لیلیٰ کو سب سے پہلے محمل ہی کے پردے میں سے دیکھا تھا

لیلائے ظلمت – تاریکی کی لیلیٰ مراد حسین رات

محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی – خاموشی کے ڈولے میں بیٹھ کر رات آ گئی

عروسِ شب – رات کی دلہن مراد حسین رات

فلک فروزی – آسمان کی روشنی بڑھانا

انجمن فلک کی – تاروں کے جھرمٹ کو فلک کی انجمن کہا ہے

... فلک فروزی تھی انجمن فلک کی – فلک کی انجمن آسمان کو روشن کر رہی تھی، آسمان تاروں کی وجہ سے روشن تھا

تابندہ	– روشن
رہبر ہے قافلوں کی تابِ جبیں تمھاری	– تمھاری پیشانی کی چمک قافلوں کو راستہ دکھاتی ہے (ستاروں کی چمک اور اُن کے مقام سے سمتوں کا اندازہ لگا کر سفر کیا جاتا تھا)
آئینے قسمتوں کے یہ تم کو جانتے ہیں	– اے تارو! یہ زمین کے غافل انسان علم نجوم کے سہارے تم کو اپنی قسمت کا آئینہ سمجھتے ہیں گویا تارے انسان کی قسمت کا حال بتاتے ہوں
نوا	– صدا، آواز
وسعت تھی آسماں کی معمور اس نوا سے	– پورے آسمان میں یہ آواز گونج رہی تھی (آگے کے اشعار کو بھی صدا کہا ہے)
آرسی	– آئینہ
آئینِ نو	– نیا قانون، نئے اصول
طرزِ کہن	– پرانا انداز، پرانا چلن
تیز گام	– تیز رفتار
انجم	– نجم کی جمع، تارے
رَوا رَوی	– بھاگ دوڑ، تیزی، یہ ترکیب فارسی مصدر 'رفتن' (جانا) سے بنی ہے
جذبِ باہمی	– باہمی کشش (Mutual Attraction) مراد آپسی اتحاد و اتفاق
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی انجمن میں	– تمام اجرامِ فلکی میں باہمی کشش پائی جاتی ہے اور اسی سے ان کا نظام قایم ہے۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ جذبِ باہم کا اصول تارے بھی جانتے ہیں اسی لیے وہ قایم ہیں۔ انسانوں کو ان سے سبق سیکھنا چاہیے۔

مشق و مطالعہ

(الف) مندرجۂ ذیل سوالوں کے جواب دیجیے۔

۱- شاعر نے شام کا منظر کس طرح بیان کیا ہے؟

(۴) نثار میں تری گلیوں کے

فیض احمد فیض

ولادت ۱۹۱۱ء — وفات ۱۹۸۴ء

فیض سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے عربی اور انگریزی دونوں زبانوں کے ادب میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی اور امرتسر میں کالج میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران انھوں نے کالج کی ملازمت چھوڑ دی۔ برطانوی فوج میں لیفٹیننٹ کے عہدے پر اُن کا تقرر ہوا۔ بعد میں انھوں نے فوجی ملازمت ترک کر دی اور پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر ہو گئے۔ کچھ عرصے تک اُنھوں نے ایک ادبی رسالہ امروز کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۵۱ء میں فیض کو پاکستان کی فوجی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش کرنے کے الزام میں چار سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ اُن کی بہت سی نظمیں اسیری کے انھی ایام میں لکھی گئی ہیں۔ رہائی کے بعد وہ کئی برس تک پاکستان سے جلا وطن رہے۔ اس دوران انھوں نے یورپ اور مشرق وسطیٰ کے بیشتر ممالک کا دورہ کیا اور بیروت میں رہ کر ایک انگریزی رسالے 'لوٹس' کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔

فیض کا شمار ترقی پسند تحریک کے قافلہ سالاروں میں ہوتا ہے۔ زبان کا گداز، لہجے کی شیرینی اور جذبے کی دھیمی آنچ نے اُن کی شاعری کو دل کشی اور مقبولیت بخشی ہے۔ مظلوم و محروم لوگوں کے حقوق کی بازیابی اور ظلم و ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔

ذیل کی نظم میں فیض ملک میں بننے والے جابرانہ و غیر منصفانہ قوانین اور جمہوری حقوق سے محروم لوگوں کی مجبوری و افلاس پر ماتم کرتے ہیں۔ ملک کا نظام بے ایمان اور بے انصاف لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ آزادی کی نعمتوں سے محروم لوگ اچھے دنوں کی آس لگائے مسلسل سختیاں جھیل رہے ہیں اور اُن کی مایوسی کے ایام ختم ہونے میں نہیں آتے لیکن ظلم و ناانصافی کا یہ دور زیادہ دن نہیں چلے گا۔ اس کے خلاف کی جانے والی

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم و جان بچا کے چلے
ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جو کے لیے
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس، مدعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

یوں ہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی

یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ اُن کی ہار نئی ہے، نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلا نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے
گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی جدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا اُستوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

معانی و اشارات

نثار	-	قربان، صدقے
طواف	-	گرد گھومنا، کسی مقدس مقام کے گرد چکر لگانا۔ شاعر نے وطن کی سرزمین کو مقدس اور قابلِ تعظیم بتاتے ہوئے ذہن و دل کی آزادی کے ساتھ اس کی راہوں پر چلنے کو طواف سے تشبیہ دی ہے۔
اہلِ دل	-	وطن پرستوں کے لیے اہلِ دل کی ترکیب استعمال کی ہے
نظم	-	انتظام
بست و کشاد	-	پابندی اور آزادی مراد حکومت کے قوانین
سنگ و خشت	-	پتھر اور اینٹ
مقید	-	قید کیا ہوا
سگ	-	کتّا

[illegible] – شیخ سعدی کی گلستان کی ایک حکایت کی طرف اشارہ ہے کہ ایک بار [illegible] ایک فقیر صدا لگاتا ہوا ایک بستی میں پہنچا تو کتے اس کے پیچھے پڑ گئے۔ اس نے انھیں بھگانے کے لیے پتھر تلاش کیا تو وہاں مشکل سے ایک پتھر ملا جو زمین میں گڑا ہوا تھا۔ فقیر بولا "اس بستی کے لوگ بھی عجیب ہیں، کتوں کو تو کھلا چھوڑ دیا ہے اور پتھر وں کو باندھ کے رکھا ہے۔" فیض نے اس مصرعے میں فوجی حکومت پر طنز کیا ہے جس نے بدمعاشوں اور ظالموں کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے اور شریفوں اور مظلوموں پر پابندی لگا رکھی ہے۔

دستِ بہانہ جو – ظلم کرنے کا بہانہ ڈھونڈنے والا ہاتھ

اہلِ ہوس – جھوٹی محبت جتانے والے مراد اہلِ حکومت

اہلِ جنوں – وطن سے سچی محبت کرنے والے

مدعی – دعوا کرنے والا، الزام لگانے والا

منصف – انصاف کرنے والا

فراق – جدائی

روزن – روشن دان

زنداں – قید خانہ، جیل

بجھا جو ... بھر گئی ہوگی – قید خانے کے روشن دان میں تاریکی چھا گئی تو شاعر نے یہ تصور کیا کہ وطن میں رات ہوگئی ہے اور آسمان پر تارے نکل آئے ہیں۔ وطن کو ایک حسین دیوی یا دلہن قرار دیتے ہوئے شاعر نے تاروں کے نکلنے کو 'تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی' کہہ کر وطن سے اپنے لگاؤ کو ظاہر کیا ہے۔ اس شعر میں دلہن کا استعارہ بہت خوب صورت انداز میں لایا گیا ہے

سلاسل – بیڑیاں (سلسلہ- زنجیر)

چمک اٹھے ہیں — قید خانے میں صبح کی روشنی کی وجہ سے جو ہاں چمک اٹھی ...
بکھر گئی ہوگی — سمجھا کہ دلہن میں صبح ہو گئی ہوگی؛ ...
شاعر نے دلہن کے استعارے کو توسیع دی ہے

تصور — خیال، دھیان

سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں — قید خانے کے اندر مقید زندگی کو گرفت سایۂ دیوار و در میں جینا کہا ہے

خلق — دنیا کے لوگ، مخلوق

یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول — ظلم و ستم اور مشکلات کے باوجود ہم تعمیری کاموں میں مشغول ہے۔
حضرت ابراہیمؑ کے واقعے کی طرف اشارہ ہے جن کے ایمان کی ...
نے نمرود کی آگ کو بھی ان کے لیے گلزار بنا دیا تھا۔

فلک — آسمان (جمع افلاک)

گلا (گلہ) — شکوہ، شکایت، گلہ کو 'برا' کے قافیے کے طور پر الف سے لکھا گیا ہے

بہم — باہم کا مخفف، اکٹھے، ایک دوسرے کے ساتھ

رات — بُرے دور کا استعارہ ہے

اوج — بلندی، اونچائی

طالع — نصیب، قسمت

رقیب — حریف، دشمن۔ حکومت کی طرف اشارہ ہے

گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا — ظالم طاقتوں یا حکم راں طبقے کو حاصل ہونے والی برتری مراد ہے۔
شاعر کے نزدیک یہ برتری باقی رہنے والی نہیں ہے

چار دن کی خدائی — چند روزہ حکومت یا اقتدار

عہدِ وفا — وفا کا اقرار

برقرار، اٹوٹ

رات اور دن کا چکر، مراد مصیبتوں کا دور

ل و نہار

مختصر جواب دیجیے۔

۱۔ وطن میں کون سی رسم چل پڑی ہے؟

۲۔ سنگ و خشت اور سگ کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا گیا ہے؟

۳۔ قید خانے کے روشن دان تاریک ہو جانے پر شاعر نے کیا سوچا؟

۴۔ شاعر نے عہدِ وفا استوار رکھنے والوں کی کون سی خوبیاں بیان کی ہیں؟

طویل جواب دیجیے۔

۱۔ وطن میں اہلِ وطن کن دشواریوں سے دوچار ہیں؟

۲۔ شاعر کو اپنے وطن میں انصاف ملنے کی اُمید کیوں نہیں ہے؟

۳۔ شاعر قید خانے میں خود کو کن خیالات کے ذریعے تسلی دیتا ہے؟

۴۔ 'نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی' اس مصرع میں شاعر نے کس بات کی طرف اشارہ کیا ہے؟

۵۔ اس نظم میں کون کون سی تلمیحات استعمال ہوئی ہیں؟

درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

۱۔ بنے ہیں اہلِ ہوس، مدعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں

۲۔ جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

⑤ تو مرے ساتھ کہاں جائے گی

ن۔م۔راشد

ولادت: ۱۹۱۲ء
وفات: ۱۹۷۵ء

ن۔م۔ راشد کا شمار میراجی اور اختر الایمان کی طرح ترقی پسند شاعروں سے الگ راہ نکالنے والے شعرا میں ہوتا ہے۔ آزادی سے قبل آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھے۔ تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ایران اور امریکہ میں پاکستان کے سفیر بھی رہے۔ بعد میں اقوامِ متحدہ میں ایک اعلا عہدے پر خدمات انجام دیتے رہے۔ آخری عمر میں انگلستان میں جا بسے تھے اور وہیں آخری سانس لی۔

ذیل کی نظم 'کلیاتِ ن۔م۔ راشد' سے لی گئی ہے۔ اس میں انھوں نے حُبِّ وطن کے جذبے سے سرشار ایک سپاہی کی جرأت اور حصولِ آزادی کے بے پناہ شوق کو پیش کیا ہے۔ یہ نوجوان سپاہی اس کے ساتھ چلنے پر اصرار کرنے والی نئی نویلی دلہن کو سمجھاتا ہے کہ وطن کے لیے لڑنے والے سپاہیوں کی راہ بہت کٹھن ہے اور ایک نازک اندام خاتون کا ساتھ اس راہ کو اور بھی دشوار بنا دے گا۔

آزاد نظم میں روایتی شعری ہیئت کی پابندی نہیں ہوتی۔ اِس میں کسی وزن کا ایک رُکن چن کر اُس کی تکرار کی جاتی ہے۔ آہنگ کے تقاضوں کے مطابق مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ اُردو کے مشہور شاعر اختر الایمان نے اردو میں آزاد نظمیں بڑی کامیابی سے کہی ہیں۔ جدید شاعری کا بڑا حصہ آزاد نظموں پر مشتمل ہے۔

معرّا نظم میں روایتی نظم کے مطابق بحر اور وزن کی پابندی ہوتی ہے۔ البتہ مصرعے بے قافیہ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی موزونیت کے اعتبار سے قافیہ استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں پہلی بار طباطبائی نے معرّا نظم لکھی۔

... کے کلیات میں یہ نظم 'سپاہی' کے عنوان سے شامل ہے۔

تو مرے ساتھ کہاں جائے گی
میں تو اک عام سپاہی ہوں، مجھے
عمر بھر دوڑ کے منزل کے قدم لینے کا
اور اسی سعی جگر دوز میں جاں دینے کا
تو مرے ساتھ مری جان، کہاں جائے گی؟

تو مرے ساتھ کہاں جائے گی؟
راہ میں اونچے پہاڑ آئیں گے
دشت بے آب و گیاہ
اور کہیں رودِ عمیق
بے کراں، تیز و کف آلود و عظیم
اجڑے سنسان دیار
اور دشمن کے گراں ڈیل جواں
جیسے کہسار پہ دیودار کے پیڑ
ہر طرف خون کے سیلاب رواں
اک سپاہی کے لیے خون کے نظاروں میں
جسم اور روح کی بالیدگی ہے
تو مگر تاب کہاں لائے گی
تو مرے ساتھ مری جان کہاں جائے گی؟

عمر گزری ہے غلامی میں مری
اس سے اب تک مری پرواز میں کوتاہی ہے!
زم زمے اپنی محبت کے نہ چھیڑ
اس سے اے جان! پروبال میں آتا ہے جمود
دیکھ خوں خوار درندوں کے وہ غول
مرے محبوب وطن کو یہ نگل جائیں گے
ان سے ٹکرانے بھی دے
جنگِ آزادی میں کام آنے بھی دے
تو مرے ساتھ مری جان کہاں جائے گی؟

معانی واشارات

سعی - کوشش
سعیِ جگر دوز - جاں توڑ کوشش
دشتِ بے آب وگیاہ - ایسا ریگستان جس میں نہ پانی ہو نہ ہریالی
رودِ عمیق - گہرا دریا
بے کراں - بہت وسیع
کف آلود - جھاگ بھرا مراد غصے میں (دریا کی موجوں سے پیدا ہونے والے جھاگ کی وجہ سے اسے کف آلود کہا ہے۔ غیظ کی حالت میں عام طور پر منہ میں جھاگ آنے لگتا ہے)
گراں - بھاری
ڈیل - بدن

بھاری بھرکم، بڑے قد و قامت والا

پرورش، پروان چڑھنا

غلامی کی وجہ سے صلاحیتیں ابھر نہیں پاتیں اور انسانی جوہر کھل نہیں پاتے۔ اقبال کے ایک شعر میں یہ ترکیب اس طرح استعمال ہوئی ہے

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

- جم جانا، بے حس و حرکت ہونا
- اُڑنے کی قوت ختم ہو جاتی ہے

مشق و مطالعہ

(الف) مندرجۂ ذیل سوالات کے جواب دیجیے۔

۱۔ جنگ میں مصروف سپاہی کو کن کن مقامات سے گزرنا پڑتا ہے؟

۲۔ سپاہی نے دشمن کے بارے میں کس خیال کا اظہار کیا ہے؟

۳۔ سپاہی غلامی سے بیزار کیوں ہے؟

۴۔ سپاہی کو دشمنوں سے کیا خوف ہے؟

(ب) اس نظم کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

●●●

ولادت: ۱۹۱۸ء
وفات: ۲۰۰۲ء

کیفی اعظمی کا اصلی نام سیّد اطہر حسین رضوی تھا۔ اُتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں مجواں میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد سیّد فتح حسین رضوی زمین دار اور اودھ کی مشہور ریاست بلہرہ کے تحصیل دار تھے۔ کیفی اعظمی کو لکھنؤ کے ایک مدرسے سلطان المدارس میں داخل کیا گیا لیکن ایک ہڑتال میں عملی حصہ لینے کے جرم میں انھیں مدرسے سے خارج کردیا گیا۔ کیفی اعظمی نے اپنی ذاتی کوشش سے لکھنؤ یونی ورسٹی اور الہ آباد یونی ورسٹی سے اردو، فارسی اور عربی کے مختلف امتحانات پاس کیے۔

کیفی اعظمی نے گیارہ برس کی عمر میں پہلی غزل کہی۔ شاعری کی ابتدا روایتی غزل گوئی سے ہوئی تھی، لیکن لکھنؤ میں علی عباس حسینی، علی سردار جعفری اور احتشام حسین جیسے مشہور ترقی پسند ادبا و شعرا سے ملاقات اور اُن کی صحبت سے ترقی پسند رجحانات سے متاثر ہوئے اور اپنی نظموں اور غزلوں میں مزدوروں، کسانوں اور محنت کش طبقے کی بے کیف زندگی کی عکاسی کرنے لگے۔ بمبئی آنے کے بعد فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے اور نغمہ نگار کی حیثیت سے شہرت پائی۔ انھیں ڈراموں اور اسٹیج سے بہت لگاؤ تھا۔ ڈراموں کو وہ زندگی کا عکاس تصور کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آخری عمر تک ترقی پسندوں کے قایم کردہ 'اپٹا' (انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن) کے سرگرم رکن رہے۔

اُن کی شاعری میں لہجے کی بلند آہنگی، جوش و ولولہ اور طنطنے کے ساتھ ساتھ مظلوموں اور جفا کشوں سے ہمدردی کا اظہار ہوتا ہے۔ اُن کا شعری مجموعہ 'آوارہ سجدے' بہت مشہور ہے۔ ذیل کی نظم میں انھوں نے ہندوستانی خاتون کو ایک سچا اور پایدار انقلاب لانے اور اپنے حق کے لیے لڑنے کی دعوت دی ہے۔ اس نظم میں

ایک جوش ہے، ولولہ اور گھن گرج ہے جو انقلابی دعوتِ عمل سے ہم آہنگ ہے۔ آپ
محسوس کریں گے کہ اس نظم کا لہجہ اور آہنگ ن۔ م۔ راشد کی نظم 'تو مرے ساتھ کہاں
جائے گی' سے قطعی مختلف ہے۔ کیفی اعظمی کے شعری مجموعے میں یہ نظم 'عورت' کے
عنوان سے شامل ہے۔

٭٭٭

اُٹھ مری جان ! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

تیرے قدموں میں ہے فردوسِ تمدن کی بہار
تیری نظروں پہ ہے تہذیب و ترقی کا مدار
تیری آغوش ہے گہوارۂ نفس و کردار
تا بہ کے گرد ترے وہم و تعیّن کا حصار
کوند کر مجلسِ خلوت سے نکلنا ہے تجھے
اُٹھ مری جان ! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

گوشے گوشے میں سلگتی ہے چتا تیرے لیے
فرض کا بھیس بدلتی ہے قضا تیرے لیے
قہر ہے تیری ہر اک نرم ادا تیرے لیے
زہر ہی زہر ہے دنیا کی ہوا تیرے لیے
رُت بدل ڈال اگر پھولنا پھلنا ہے تجھے
اُٹھ مری جان ! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

قدر اب تک تری تاریخ نے جانی ہی نہیں
تجھ میں شعلے بھی ہیں بس اشک فشانی ہی نہیں
تو حقیقت بھی ہے دل چسپ کہانی ہی نہیں
تیری ہستی بھی ہے اک چیز، جوانی ہی نہیں

اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا

اُٹھ مری جان ! مرے ساتھ ہی چلنا

تو فلاطون و ارسطو ہے ، تو زہرہ

تیرے قبضے میں ہے گردوں ، تری ٹھوکر میں زمیں

ہاں اُٹھا ، جلد اُٹھا ، پائے مقدر سے جبیں

میں بھی رکنے کا نہیں ، وقت بھی رکنے کا نہیں

لڑکھڑائے گی کہاں تک کہ سنبھلنا

اُٹھ مری جان ! مرے ساتھ ہی چلنا

معانی واشارات

فردوس	-	جنت
تمدن	-	اعلا درجے کا رہن سہن، تہذیب
گہوارہ	-	جھولا، پرورش کی جگہ
تیرے قدموں میں ہے فردوسِ تمدن کی بہار	-	تمدن کی جنت سے تہذیب کا اعلا ترین مقام مراد ہے جس کی بہار یعنی جس کا پھلنا پھولنا عورت کے دم قدم سے ہے یعنی تہذیب و تمدن عورت کے سبب پروان چڑھتے ہیں۔ جنت باغ کو کہتے ہیں اس لیے اس کے ہم معنی لفظ فردوس کی مناسبت سے لفظ بہار لایا گیا ہے
مدار	-	انحصار
حصار	-	گھیرا، دیوار
تا بہ کے گرد ترے وہم و تعیّن کا حصار	-	مراد عورت کب تک اوہام اور بندھے ٹکے عقیدوں کے جال میں قید رہے گی
کوند کر	-	مراد بجلی کی تیزی سے

کہ لی چار دیواری سے عورت کو فوراً اٹھانا چاہیے

اور کر مجلس خلوت

قضا – موت

رُت – موسم

اشک فشانی – آنسو بہانا

افلاطون و ارسطو – دو یونانی فلسفی

زہرہ – ایک روشن سیارے کا نام

پروین – سات ستاروں کا جھرمٹ

گردوں – آسمان

جبیں – پیشانی

اُٹھا پائے مقدر سے جبیں – مقدر کے قدموں سے پیشانی اُٹھا یعنی اپنے فیصلے تقدیر پر نہ چھوڑ اور خود اپنی ترقی کی تدبیریں کر

مشق و مطالعہ

(الف) درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے۔

١- شاعر نے عورت کو تہذیب و تمدن کا مرکز کیوں کہا ہے؟

٢- عورت کو اپنی ترقی کے لیے کیا کرنا ہوگا؟

٣- عورت کے متعلق شاعر کو تاریخ سے کیا گلا ہے؟

٤- پائے مقدر سے جبیں اُٹھانے سے کیا مراد ہے؟

٥- اس نظم کا مختصر خلاصہ تحریر کیجیے۔

عملی مشق

'آزادیِ نسواں' پر ایک مضمون تحریر کیجیے۔

توجہ دیں

آپ نے ن۔ م۔ راشد اور کیفی اعظمی دونوں کی نظمیں [illegible]
قدرے مایوسی اور بے بسی کے ساتھ وطن پرستی کا جذبہ بیان ہوا ہے لیکن اس [illegible]
حقیقت پسندی بھی ہے۔ ہندوستانی عورت اُس وقت تک اتنی تعلیم یافتہ اور [illegible]
تھی کہ سپاہیانہ جذبات کے ساتھ مرد کے شانہ بہ شانہ چل سکے۔

کیفی کی نظم میں بھی عورت کم زور اور بے بس ہے لیکن شاعر اسے [illegible]
عورت بنا کر سماجی انقلاب پیدا کرنے پر آمادہ کرنا چاہتا ہے۔ اس نظم میں جوش [illegible]
جاتا ہے۔ دونوں نظموں کے مزاج اور اسلوب کے فرق کو ذہن میں رکھ کر ان کا [illegible]
کیجیے۔

ورثہ

ساحر لدھیانوی

ولادت ۱۹۲۱ء وفات ۱۹۸۰ء

عبدالحئی ساحر لدھیانوی ترقی پسند تحریک کے مشہور شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں انسانی زندگی کے کرب کو نہایت واضح اور موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ 'تلخیاں' اور 'گاتا جائے بنجارہ' ان کی غزلوں اور نظموں کے مجموعے ہیں۔ ان کی طویل نظم 'پرچھائیاں' امن کے موضوع پر ایک قابلِ قدر تخلیق ہے۔ ان کے فلمی گیت بھی کافی مقبول ہوئے۔

ساحر کے مطابق وطن کسی ایک فرقے کی جاگیر نہیں ہے اور کسی کو کسی کا استحصال کرنے کا حق بھی نہیں ہے۔ ذیل کی نظم میں انھوں نے وطن کی عظمت کو بلند کرنے کے لیے اس کے تہذیبی ورثے کو سب کی مشترکہ امانت سمجھ کے اس کی حفاظت کرنے پر زور دیا ہے۔ کچھ لوگ اسے ایک خاص فرقے کی ملکیت سمجھتے ہیں تو کچھ لوگ اپنا غصہ اُتارنے کے لیے توڑ پھوڑ مچا کر ملک اور تہذیب کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ شاعر نے دونوں کو ایسی سوچ اور ایسے عمل سے باز رکھتے ہوئے ملک کی حفاظت کرنے کا درس دیا ہے۔

***

یہ وطن ، تیری مری نسل کی جاگیر نہیں
سیکڑوں نسلوں کی محنت نے سنوارا ہے اسے
تیرے قدموں کے تلے یا مرے قدموں کے تلے
نوعِ انساں کے شب و روز کی تقدیر نہیں
یہ وطن ، تیری مری نسل کی جاگیر نہیں
سیکڑوں نسلوں کی محنت نے سنوارا ہے اسے

یرا غم کچھ بھی سہی ، میرا الم کچھ بھی سہی
ہلِ ثروت کی سیاست کا ستم کچھ بھی سہی
ن کا ورثہ ہو کھنڈر ، یہ ستم ایجاد نہ کر
یری تخلیق نہیں تو اسے برباد نہ کر

ہلِ منصب ہیں غلط کار تو ان کے منصب
یری تائید سے ڈھالے گئے ، تو مجرم ہے
یری تائید سے ڈھالے گئے ، میں مجرم ہوں
ٹریاں ریل کی ، سڑکوں کی بسیں ، فون کے تار
یری اور میری خطاؤں کی سزا کیوں بھگتیں
ن پہ کیوں ظلم ہو جن کی کوئی تقصیر نہیں
یہ وطن ، تیری میری نسل کی جاگیر نہیں
یکڑوں نسلوں کی محنت نے سنوارا ہے اسے

پنا حق مانگ مگر ان کے تعاون سے نہ مانگ
جو ترے حق کا تصور ہی فنا کر ڈالیں
اتھ اُٹھا اپنے ، مگر ان کے جِلو میں نہ اُٹھا
جو تیرے ہاتھ ترے تن سے جدا کر ڈالیں
خوابِ آزادیِ انساں کی یہ تعبیر نہیں
یہ وطن ، تیری مری نسل کی جاگیر نہیں
یکڑوں نسلوں کی محنت نے سنوارا ہے اسے

معانی و اشارات

مال و دولت والے، سرمایہ دار

- اعلا عہدے دار، حکمراں طبقہ

تو ... – ہم نے خود اپنے نمایندوں کا انتخاب کیا ہے اور انھیں منصب دیے ہیں۔ اگر وہ غلط کام کرتے ہیں تو اس کی ذمہ داری ہم پر بھی عاید ہوتی ہے کہ ہم نے ایسے نمایندوں کو کیوں منتخب کیا

- قصور

- ہم راہی، ساتھ

...پنے حکمران کے ... اُٹھا – ان کے ساتھ یا ان کی حمایت میں ہاتھ نہ اُٹھا

- خواب کی تشریح، خواب کا نتیجہ

مندرجۂ ذیل سوالات کے جواب دیجیے۔

۱۔ شاعر نے یہ کیوں کہا کہ یہ وطن کسی کی جاگیر نہیں ہے؟

۲۔ انسانوں کی خطاؤں کی سزا کن کو بھگتنی پڑتی ہے؟

۳۔ اپنا حق مانگنے کے لیے کن لوگوں کی مدد نہیں لینی چاہیے؟

اس نظم میں شاعر نے عوام کو کن باتوں سے دور رہنے کے لیے کہا ہے؟

●●●

⑧ شاعر اور اس کی بیوی

سلیمان خطیب

ولادت: ۱۹۲۲ء

وفات: ۱۹۷۸ء

سلیمان خطیب کا اصلی نام محمد سلیمان تھا۔ وہ کرناٹک کے ضلع بیدر کے ایک مقام معین آباد کے ایک خطیب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ کم عمری ہی میں ماں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اُنھوں نے میٹرک میں تعلیم حاصل کی اور ۱۹۴۱ء میں ترقی کر کے مہتمم محکمۂ آب رسانی ہو کر ۱۹۷۷ء میں وظیفہ یاب ہوئے۔

سلیمان خطیب کو نوجوانی ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ انھیں دکنی لوک گیتوں سے خاص دل چسپی تھی، جس کے نتیجے میں انھوں نے دکنی زبان ہی کو وسیلۂ شاعری بنایا۔ زبان کی تازگی، خیالات کی صفائی، مزاح کی چاشنی، دل کو چھو لینے والے انداز بیان اور نظموں میں مکالماتی فضا کی وجہ سے بہت کم عرصے میں انھوں نے ملک گیر شہرت حاصل کی۔

اُن کا شعری مجموعہ 'کیوڑے کا بن' کافی مشہور ہے۔ ذیل کی نظم اسی کتاب سے لی گئی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے میاں بیوی کے درمیان ہونے والی نوک جھونک کو موضوع بنایا ہے اور شوہر کی گفتگو میں معیاری اردو اور بیوی کے مکالمے کے لیے دکنی اردو کو وسیلۂ اظہار بنایا ہے، جس سے اس نوک جھونک میں انوکھا لطف پیدا ہو گیا ہے۔

***

شاعر اپنی بیگم سے:

وہ غزل میں نے کہی ہے کہ غزل جھوم اُٹھے

کہکشاں ٹوٹ پڑے، دل کا کنول جھوم اُٹھے

جیسے جمنا میں حسیں تاج محل جھوم اُٹھے

کیا خیالات ہیں ، کیا چیز ہے بولو بیگم
لعل ، یاقوت میں ہر شعر کو تولو بیگم
تم تو بیٹھی ہو فقط ہاتھ میں لہسن لے کر
کبھی ادرک ، کبھی مرچیں ، کبھی بینگن لے کر

کیا کلیجے کو ، مرے جی کو جلا دیتا ہے
باتاں باتاں میں اَصَل بات اُڑا دیتا ہے
پیسے پوچھے تو فقط شعر سنا دیتا ہے
شاعری کرنا تجھے کون سکھا کو چھوڑے
اچھے خاصے مرے آدمی کو کھپا کو چھوڑے
شاعری ماٹی پڑو جان کا جوکھم ہوگئی
کھیتی باڑی کرو ، دھندا کرو ، بیچو گھوڑے

میری خدمات کی اک دھوم مچے گی بیگم
ساری دنیائے ادب جھوم اٹھے گی بیگم

پیاسے شاعر کو تو پانی نہیں دیتی دنیا
نہریں گھی دودھ کی تربت پہ بہا دیتی ہے
سر چھپانے کو تو ملتا نہیں چھپّر کوئی
سنگِ مرمر کی مزاریں تو بنا دیتی ہے

معانی و اشارات

باتاں	-	باتوں باتوں
اصل	-	سچ مچ اصل ہے
کون عکر کو چھوڑے	-	کس نے سکھایا ہے
مرے ادمی کو کمہا کو چھوڑے	-	میرے آدمی (شوہر) کو ناکارہ بنا دیا ہے

مشق و مطالعہ

(الف) سوالات کے جواب دیجیے۔

۱- شاعر اپنی غزل کی تعریف کس طرح کرتا ہے؟

۲- شاعر اپنے خیالات کی کیا قدر و قیمت بتاتا ہے؟

۳- بیوی کو شوہر سے کیا شکایت ہے؟

۴- اپنی شاعری کے بدلے میں شاعر کو کیا توقعات ہیں؟

(ب) دنیا والوں کی مردہ پرستی پر سلیمان خطیبؔ نے کس طرح طنز کیا ہے؟

(ج) اپنی اسکول لائبریری سے 'کیوڑے کا بن' حاصل کیجیے اور اس کا مطالعہ کیجیے

●●●

شہر کنچن پٹن

(مثنوی)

ابن نشاطی

دکن کی قطب شاہی حکومت کے زمانے میں گولکنڈہ میں شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ ابن نشاطی اس عہد کے ایک عظیم فن کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی زندگی کے حالات معلوم نہیں۔ 'پھول بن' اس کی لافانی مثنوی ہے جس سے اس کے بارے میں کچھ کچھ اشارے ملتے ہیں۔ ابن نشاطی کو دربار سے زیادہ عوام میں مقبولیت حاصل تھی۔ زبان کی سادگی اور سلاست کے اعتبار سے اس کی مثنوی 'پھول بن' دکنی شاعری کا عمدہ نمونہ کہی جاسکتی ہے۔

ذیل کا اقتباس 'پھول بن' سے لیا گیا ہے۔ اس میں شہر کنچن پٹن کا ذکر ہے۔ کنچن سونے کو کہتے ہیں۔ اس شہر کی زمین بڑی زرخیز تھی گویا سونا اُگلتی تھی اور یہاں سوکھی لکڑی کو بھی گاڑ دیا جائے تو سرسبز ہوجاتی تھی اس لیے اس کا نام کنچن پٹن پڑ گیا تھا۔

***

بوٹی ہے باغباں اس 'پھول بن' کا ۔۔۔ چمن لایا ہے یوں تازہ سخن کا

کتے یک شہر مشرق کے کدن تھا ۔۔۔ کہ اس کا ناؤں سوں کنچن پٹن تھا

گگن کے تل کنیں ایسا شہر نادر ۔۔۔ نہیں دیکھے تھے انکھاں کے مسافر

زمیں پر شہر بھی ایسا ہے گر کنیں ۔۔۔ کسی کاناں کے جاسوساں سنے نئیں

عجب تاثیر تھا واں کی ہوا کا ۔۔۔ سدا ہنگام تھا نشو و نما کا

سُکی لکڑی اگر کئی لا کو گاڑے — وو لکڑی سبز ہو شاخاں کو کاڑے

بکھیرے تو زمیں پر واں کی کانٹے — وو چھٹتے تے ہوکر پھولاں پھانٹے

وہاں چشمے جو نکلے تے زمیں تے — مٹھائی میں میٹھے تے انگبیں تے

سدا خوش حال تے سب لوگ واں کے — تے خاطر جمع واں کے ساکناں سے

وِلاں کے آہواں سب کے سدا کال — جفا کے تیر سوں تے فارغ البال

جتا لیوے بی عشرت کم نہ تھا واں — اتھا سب کچھ وسیلے یک غم نہ تھا واں

خوشی کا میگ اچھے جم دھاں برستا — اتھا اس دھات سوں وو شہر بستا

دیکھو اس شہر کے شہ میں اتھے تِس دن دو خاصیت
یکے آداب اسکندر ، دِگر ادراکِ لقمانی

معانی و اشارات

جو کئی - جو کوئی

پھول بن - پھولوں کا باغ۔ ابنِ نشاطی کی مثنوی کے نام 'پھول بن' کی مناسبت سے پہلے شعر میں باغباں اور چمن کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ کسی طویل حکایت کو پیش کرنے والی مثنوی کے ہر نئے باب کا آغاز ایسے شعر سے ہوتا ہے جس میں آگے کے بیان کی طرف اشارہ ہو۔ یہ شعر اس کی ایک مثال ہے۔

سخن - بات

کتے - کہتے (ہیں کہ)

کدن - طرف، جانب

ناتوں - نام

	– سونے کی گھڑی
بن وچ	– آسمان کے بیچ یعنی دنیا میں
محل کے محل	– کہیں (یہ لفظ 'کہیں' بھی بولا جاتا
کہیں	– نایاب، انوکھا
[illegible]	– آنکھیں
اکھاں	– نظریں دور تک جاتی ہیں اس لیے
اکھاں کے مسافر	شاعر کہنا چاہتا ہے کہ آنکھوں نے
	– کان کی جمع
کاناں	– جاسوس کی جمع، دوسرے ملکوں یا
جاسوساں	– مخبر کانوں سے سُن گُن لیتے رہتے
کاناں کے جاسوساں	– موسم، فصل، زمانہ
ہنگام	– پودوں کا پروان چڑھنا
نشوونما	
سکی	– سوکھی
لاکو	– لاکر
وو	– وہ
شاخاں	– شاخ کی جمع
کاڑے	– نکالے (کاڑنا - نکالنا)
پھانٹے	– پھانٹا کی جمع (پھانٹا - شاخ)
دو پھٹتے تھے ہوکر	زمین پر کانٹے بکھیر دو تو اس
پھولاں کے پھانٹے	– تھے (اس شعر میں شاعر نے
تے	– سے
مٹھائی	– مٹھاس
مٹھے	– میٹھے

نگبیں — شہد

خاطر — دل

تھے خاطر جمع — مطمئن تھے

ساکناں — ساکن کی جمع، رہنے والے

دلاں — دل کی جمع

آہواں — آہو کی جمع، ہرن

دلاں کے آہواں — دل چنچل ہوتا ہے اس لیے اسے ہرن کہا ہے

کال — زمانہ

سدا کال — ہر وقت، ہمیشہ

ارغ البال — فکروں سے آزاد

جتا — جتنا

یوے — حاصل کرنا چاہیے

بی — بھی

عشرت — عیش

واں — وہاں

تھا — تھا

ولے — لیکن

میگ — ابر، بادل

جم — ہمیشہ

دھاں — وہاں

دھات — طرح، ڈھنگ

س دن — رات دن، ہمیشہ

- دو خاصیتیں، یہاں لفظ دو کا 'واو' مضمومہ حرف ما قبل پیش (ُ) کا کام کرتا ہے

- سکندر اعظم کے ادب، ڈھنگ یا طور طریقے
- حکیم لقمان کی سمجھ اور عقل

آخری شعر الگ بحر میں ہے۔ یہاں شہر کی تعریف ختم ہوتی ہے اور کنچن پٹن کے بادشاہ کا قصہ شروع ہوتا ہے۔ یہ آخری شعر اس قصے کی تمہید ہے۔

مندرجہ ذیل سوالات کے جواب دیجیے۔

- کنچن پٹن نادر شہر کیوں ہے؟
- اس شہر کی ہوا کی تاثیر کیا تھی؟
- کنچن پٹن کے دریاؤں کی خوبی کیا ہے؟
- کنچن پٹن کے لوگوں کا احوال اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔
- مندرجہ ذیل شعر کی تشریح کیجیے۔

دیکھو اس شہر کے شہ میں اتھے نس دن دو خاصیّت
یکے آدابِ اسکندر، دِگر ادراکِ لقمانی

- اس نظم کا خلاصہ لکھیے۔

●●●

۱۰

تہنیت بہادر شاہ ظفر
(قصیدہ)

ذوقؔ

ولادت: ۱۷۸۹ء
وفات: ۱۸۵۴ء

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ایک معمولی سپاہی کے بیٹے تھے مگر اپنی شعر گوئی کی صلاحیت کے سبب ترقی کر کے مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد ہو گئے۔

ذوقؔ نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی لیکن قصیدہ نگاری میں نام پیدا کیا۔ سوداؔ کے بعد اُردو کے سب سے بڑے قصیدہ نگار مانے جاتے ہیں۔ ان کے قصیدوں میں لفظوں کی شان و شوکت نمایاں ہے۔ زبان بامحاورہ ہوتی ہے۔ یہ قصیدہ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے بیماری سے شفا پانے پر بطور تہنیت لکھا تھا۔ اس وقت ظفر ولی عہد تھے۔

قصیدہ اردو کی وہ صنف ہے جس میں شاعر کسی بادشاہ، امیر یا بزرگ کی تعریف و توصیف اور مدح کرتا ہے۔ جس کی مدح کی جاتی ہے اسے 'ممدوح' کہتے ہیں۔ غزل کی طرح قصیدے کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اسے مطلع کہتے ہیں۔ غزل ہی کی طرح بقیہ تمام اشعار کے دوسرے مصرعے بھی ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ قصیدے کے درمیان کے اشعار بھی مطلع ہو سکتے ہیں۔

قصیدے کے پانچ اجزائے ترکیبی ہیں:

۱۔ تشبیب ۲۔ گریز ۳۔ مدح ۴۔ حسنِ طلب ۵۔ دعا

تشبیب دراصل تمہید ہوتی ہے۔ اس میں شاعر مدح کے لیے فضا تیار کرتا ہے۔

ہے ہیں۔ آخر میں شاعر اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے دعا پر قصیدے کو ختم کرتا ہے۔

واہ وا ! کیا معتدل ہے باغِ عالم میں ہوا
مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا

ہے لطف ہوا سے اس قدر پیدا لہو
ہوتا برگ میں ہر نخل کے سرخی ہے جوں برگِ حنا

آ گیا اصلاح پہ ایسا زمانے کا مزاج
تا زبانِ خامہ بھی آتا نہیں حرفِ دوا

اس قدر جاتی رہی عالم سے بیماری کہ آج
نام گلشن میں نہیں ہے نرگسِ بیمار کا

واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کی ہو
جب کہ ہو اس سے نویدِ غسلِ صحت ، جاں فزا

وہ ولی عہدِ زماں مرزا محمد بو ظفر
اس کی قوت گر ضعیفوں کو بنادے اَقوِیا

شادیٔ صحت سے اس کی ، آج ہوکر شاد شاد
تہنیت خوانی میں ہیں سرگرم سب مِدحت سرا

شادیٔ صحّت کا تیری کیا کہوں عالم کہ آج
جوشِ عشرت سے یہ عالم بن گیا عِشرت سرا

فی الحقیقت یہ وہ شادی ہے کہ اس کے روبرو
جشنِ جمشیدی کا کچھ مطلق نہیں رتبہ رہا

... کہتا ... عاجز آگے بس تعریف میں
ہے اٹھا کر ذوق میں دستِ دعا
رکھے صحت سے ہمیشہ شافیِ مطلق تجھے
جو ترے بدخواہ ہیں وہ رنج میں ہوں مبتلا

معانی و اشارات

معتدل	- اعتدال رکھنے والی یعنی نہ زیادہ تیز نہ زیادہ سست
مثلِ نبضِ صاحبِ صحت	- صحت مند آدمی کی نبض کی طرح
لُطف	- کرم، لطافت
اَقوِیا	- (واحد قوی) قوت والے
مدحت سرا	- تعریف کرنے والا
عشرت سرا	- عیش و عشرت کا مکان
جشنِ جمشیدی	- قدیم ایران کے بادشاہ جمشید کے دور کا جشن، جشنِ نوروز
خامہ	- قلم

(الف)

۱- موجِ صبا کو کس سے تشبیہ دی گئی ہے؟
۲- درخت کے پتوں میں حنا کی سی سرخی کیوں پیدا ہوگئی؟
۳- ذوقؔ نے ممدوح کے حق میں کیا دعا کی ہے؟

(۱) تھی حسرت کا تیری کیا کہوں عالم کہ آج
جوشِ عشرت سے یہ عالم بن گیا عشرت سرا

اس شعر میں لفظ عالم دو بار آیا ہے۔ دونوں جگہ ایک جیسا پڑھا جائے گا لیکن دونوں جگہ الگ الگ معانی ہیں۔ پہلے مصرعے میں عالم کے معنی 'کیفیت اور حالت' ہے اور دوسرے میں دنیا۔ شعر میں جب دو لفظ بولنے یا لکھنے میں ایک دوسرے سے مکمل طور پر یا کم و بیش ملتے جلتے ہوں لیکن معنی میں مختلف ہوں تو اس صنعت کو تجنیس کہتے ہیں۔

(۲) تجنیسِ تام: جب کسی شعر میں کوئی لفظ دو بار اس طرح استعمال ہو کہ اس کے بولنے اور لکھنے دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہ ہو البتہ معانی الگ الگ ہوں تو اس مماثلت کو تجنیسِ تام کہتے ہیں۔ تجنیسِ تام میں لفظ تحریر اور تلفظ میں یکساں ہوتے ہیں، حرفوں کی تعداد و ترتیب اور حرکت و سکون میں مماثل ہوتے ہیں البتہ اُن کے معانی میں فرق ہوتا ہے۔

(۳) تجنیسِ ناقص: ان الفاظ پر غور کیجیے:

قدم اور دم، قیامت اور قامت، باد اور بادل

دم اور قدم میں پہلا ایک حرف کم ہے۔ قامت اور قیامت میں بیچ کا ایک حرف کم ہے اور باد اور بادل میں آخر کا ایک حرف کم ہے۔ جب کسی شعر میں ایسے دو الفاظ شامل ہوں جن میں صرف ایک حرف کا فرق ہو تو اس خصوصیت کو تجنیسِ ناقص کہتے ہیں۔

●●●

حضرت علی اصغرؓ کی شہادت

(۱۱)

(مرثیہ)

ڈاکٹر وحید اختر

ولادت: ۱۹۳۵ء

وفات: ۱۹۹۶ء

وحید اختر کا تعلق یو۔پی کے گاؤں نصیر آباد سے تھا۔ ان کے والد تلاش معاش میں دکن آئے۔ وحید اختر ۱۲؍اگست ۱۹۳۵ء کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد سے بی۔اے اور ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں علی گڑھ یونیورسٹی سے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور وہیں پروفیسر ہوگئے۔

وحید اختر کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں 'پتھروں کا مغنی' 'شب کا رزمیہ' 'زنجیر کا نغمہ' اور مرثیوں کا مجموعہ 'کربلا تا کربلا' قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ خواجہ میر دردؔ کی شاعری پر ان کا ایک پُرمغز تحقیقی مقالہ شائع ہو چکا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'فلسفہ اور ادبی تنقید' مشہور ہے۔

ذیل کا مرثیہ ان کی کتاب 'کربلا تا کربلا' سے لیا گیا ہے جس میں حضرت امام حسینؓ کے چھ ماہ کے بیٹے حضرت علی اصغرؓ کی میدان کربلا میں شہادت کا ذکر بڑے دردانگیز اور جذباتی انداز میں کیا گیا ہے۔

لے آئے چھپائے ہوئے دامن میں شہ دیں
تھا خشک لب و خشک دہن یہ گلِ بے کیں
شش ماہہ سزا پائے یہ ہے کون سا آئیں
قربانیاں اس شان کی دنیا نے نہ دیکھیں

جس وقت کہ دامن رخِ زیبا سے ہٹا ہے
تھا سب کو گماں رحل پہ قرآن کھلا ہے

...پھر کے رونے لگے دشمن کے سپاہی
...تھا، شرما گئی خود تیرہ نگاہی
...کو لو دینے لگی دل کی سیاہی
...ہم قاتل بھی صداقت کی گواہی
اعجاز تھا یہ ساقیِ کوثر کے خلف کا
ذلّت کو خیال آ گیا انساں کے شرف کا

...ت تھے، مجبور تھے، بے بس تھے جفاکار
...ہوئے صداقت سے تھے عاجز رسن و دار
...طفل پہ اُٹھتی نہیں تلوار
...صورت خموشی کو دباتی نہیں للکار
تھی کس میں یہ جرأت کہ وہ شمشیر پکڑتا
کٹ جاتے تھے دل، تیرِ نظر جس پہ بھی پڑتا

...ہاں ایک کماں ایسی تھی جیسے ہو کڑا دل
...و تیر بھی اس کا تھا، وہ تھا زہر سے قاتل
...رجاتے جو کھاتے بھی ہوا اس کی عنادل
...و پاتا دلِ کوہ بھی اس کے نہ مقابل
اس تیر کو چھے ماہ کے معصوم نے روکا
شبّیر کے دل، بچے کے حلقوم نے روکا

معانی و اشارات

شہِ دیں	– مراد حضرت امام حسینؓ
کیں	– کینہ
بے کیں	– جس کے دل میں کینہ نہ ہو یعنی معصوم
گلِ بے کیں	– معصوم پھول مراد حضرت علی اصغرؓ
شش ماہہ	– حضرت علی اصغرؓ کی عمر اس وقت چھے ماہ کی تھی
جس وقت کہ دامن ... .قرآن کھلا ہے	– حضرت امام حسینؓ نے جب علی اصغرؓ کے چہرے سے اپنا دامن ہٹایا ان کا چہرہ رحل پر رکھے ہوئے قرآن کی مانند پاک اور روشن معلوم ہوا
تیرہ	– تاریک، سیاہ
تیرہ نگاہی	– خوبیوں کو نہ دیکھ پانا
لو دینے لگی دل کی سیاہی	– دشمنوں کے بے رحم دلوں میں بھی محبت اور رحم پیدا ہوا۔ (سیاہی دشمنی و بے رحمی کا اور 'لو' محبت و رحم کا استعارہ ہے۔)
خَلَف	– اولاد
شَرَف	– عزت، بزرگی
اعجاز	– معجزہ
ساقیِ کوثر	– مراد آں حضرتؐ جن کے ہاتھوں محشر میں اُمت کو آبِ کوثر نصیب ہوگا
بے دست	– مجبور
رسن و دار	پھانسی دینے کے لیے استعمال ہونے والی رسی اور لکڑی کا ڈھانچا
خوشبوئے صداقت سے تھے عاجز رسن و دار	– صداقت کی خوش بو کو رسن و دار گرفت میں لینے اور ختم کرنے سے قاصر تھے
عنادل	– عندلیب کی جمع (عندلیب - بلبل)
حلقوم	– گلا، گردن

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب لکھیے۔

۱۔ مرثیے میں کس شخص کی شہادت کا ذکر ہے؟

۲۔ کس واقعے کو ... کی گواہی کہا گیا ہے؟

۳۔ غداروں کی کیا مجبوری تھی؟

مرثیے کے واقعے کی روشنی میں ان مصرعوں کی وضاحت کیجیے۔

۱۔ ذلت کو خیال آ گیا انساں کے شرف کا

۲۔ مر جاتے جو کھاتے بھی ہوا اس کی متادل

یہ مرثیہ مسدس کی صورت میں ہے۔ اس میں کربلا میں حضرت علی اصغرؑ کی شہادت کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ جس مرثیے میں کربلا کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے اسے 'کربلائی مرثیہ' کہتے ہیں۔ کسی شخص کے انتقال پر جو مرثیہ کہا جاتا ہے اسے 'شخصی مرثیہ' کہتے ہیں۔

تشبیہ و استعارہ: تحریر میں خوبی پیدا کرنے کے لیے صنعتوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ان میں صنعت تشبیہ کا استعمال عام ہے۔ تشبیہ بیان کا وہ طریقہ ہے جس میں ایک شخص، شے یا بات کو کسی مشترک خوبی یا صفت کے سبب دوسرے شخص، شے یا بات کے مشابہ بتایا جاتا ہے۔ اس میں جیسا، مانند، طرح جیسے حروف تشبیہ استعمال کیے جاتے ہیں۔ کبھی حروف تشبیہ کا استعمال نہیں بھی ہوتا ہے۔

استعارہ بیان کا وہ طریقہ ہے جس میں ایک شخص، شے یا بات کو کسی مشترک خوبی یا صفت کے سبب براہِ راست دوسرے شخص، شے کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس میں حروف تشبیہ کا استعمال نہیں ہوتا۔ اس میں لفظ اصلی معنی میں استعمال ہونے کی بجائے مجازی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

●●●

ولادت: ۱۷۹۷ء　　　وفات: ۱۸۶۹ء

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں دہلی میں آ بسے۔
ز بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ فارسی اور اردو میں شاعری کی۔ پہلے مشکل پسندی
پر مائل تھے۔ پھر دوستوں کے مشورے پر آسان رنگ میں کہنے لگے۔ بہادر شاہ ظفر
کے دربار میں رسائی ہوئی۔ شیخ ابراہیم ذوقؔ کی وفات کے بعد بادشاہ نے غالبؔ کو اپنا
ستاد مقرر کیا اور نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب سے نوازا۔

غالبؔ کا شمار اردو کے عظیم ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف
شاعری کے فرسودہ مضامین اور خیالات کو ندرت اور تازگی کے ساتھ اپنے کلام میں ادا
کیا بلکہ نئے نئے مضامین بھی پیدا کیے۔ موضوع کے لحاظ سے ان کی شاعری کا کینوس
ہت وسیع ہے۔ مضمون آفرینی میں کوئی ان کا ہم سر نہیں۔ تخیل کی بلندی، انسانی
جذبات کی مصوری، شوخی و ظرافت، انسان دوستی، فصاحت و بلاغت ان کی شاعری کی
نمایاں ترین خصوصیات ہیں۔ اردو ادب میں غالبؔ کے خطوط بھی ان کی شاعری کی
طرح منفرد حیثیت رکھتے ہیں

نکتہ چیں ہے، غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا وہ ہے اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

معانی واشارات

نکتہ چیں	– ہر بات میں عیب نکالنے والا
غیر	– رقیب
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے	– رقیب جان بوجھ کر محبوب کے خط کو اس طرح لے کے پھرتا ہے کہ سب کی نظر پڑے
جلوہ گری	– دنیا کے موجودات میں خدا کا نور ظاہر ہونا
کہہ سکے کون...... اٹھائے نہ بنے	– دنیا کی ہر شے میں خدا کا جلوہ موجود ہے لیکن اس حقیقت پر اس طرح پردہ پڑا ہوا ہے کہ اسے ہر کوئی سمجھ نہیں پاتا

... سنائے نہ بنے
... جہاں بات بنائے نہ بنے

... اپنے دل کا غم سنا نہیں سکتا کیوں کہ وہ ہر بات میں مین میخ نکالتا ہے ... ہے۔ میری تدبیر وہاں کیا کارگر ہو سکتی ہے جہاں میں کوئی بات بنا نہیں سکتا۔ یہاں بات ... بنانا سے مراد تدبیر نکالنا اور بات کا بنانا سے مراد اپنا مطلب حاصل کرنے کے لیے بات ... ہے۔

توجہ طلب

مطلع میں 'نکتہ چیں ہے' کے بعد وقفے کا نشان (،) ہے۔ اگر یہاں وقفہ نہ دیا جائے تو یہ گمان ہوتا ہے کہ وقفہ 'غم دل' کے بعد ہے۔ اس صورت میں شعر میں ایک لطیف تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ غم دل ہی نکتہ چیں ہو جاتا ہے۔ غم دل (شاعر سے) ... کرتا ہے کہ تو (شاعر) کیوں مجھے (یعنی غم کو) اُس پر ظاہر نہیں کرتا۔ شاعر کا یہ عذر ہے کہ وہ پہلے تو غم کا اظہار نہیں کر پاتا اور پھر غم کو کیا معلوم کہ اظہار ہو بھی جائے تو وہاں کوئی بات بنانے سے بن نہیں پاتی۔

مشق و مطالعہ

۱۔ مندرجۂ ذیل شعر کی تشریح کیجیے۔

میں بلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

غزل-۲

بہادر شاہ ظفر

ولادت ۱۷۷۵ء وفات ۱۸۶۲ء

ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ نام اور ابوظفر ان کا تاریخی نام تھا۔ اسی نام کی رعایت سے انھوں نے ظفر تخلص اختیار کیا تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت لال قلعے ہی میں ہوئی۔ انھوں نے مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل کی۔ عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ برج بھاشا اور پنجابی زبانیں بھی جانتے تھے، اور انھوں نے ان زبانوں میں بھی شعر کہے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر باسٹھ سال کی عمر میں ۱۸۳۷ء میں دہلی کے تخت پر بیٹھے لیکن ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف ہونے والی بغاوت (کی سربراہی) کے الزام میں قید ہوئے۔ انگریزوں نے انھیں، ان کی بیگم زینت محل اور خاندان کے دوسرے افراد کے ہمراہ رنگون (برما) بھیج دیا۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

ظفر نے ابتدا میں شاہ نصیر الدین نصیر سے اصلاح لی۔ ان کے بعد عزت اللہ عشق اور میر کاظم حسین بے قرار بھی ان کے استاد رہے لیکن شیخ محمد ابراہیم ذوق کو ظفر کے استاد کی حیثیت سے جو شہرت ملی وہ کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ ذوق کے انتقال کے بعد غالب نے بھی ظفر کے کلام پر اصلاح دی۔

بہادر شاہ ظفر کی زبان قلعۂ معلیٰ کی پاکیزہ زبان تھی۔ ان کے یہاں زبان کی سادگی، سلاست و بے ساختگی کے ساتھ روزمرہ اور محاوروں کا برجستہ و برمحل استعمال ملتا ہے۔ انھوں نے غزل کے علاوہ سلام، مرثیہ، شہرِ آشوب، رباعی، قطعہ، سہرا، گیت، بھجن، ٹھمری اور دوہے جیسی اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

ظفر نے اُردو میں چار دیوان یادگار چھوڑے ہیں۔ یہ دیوان بعد میں 'کلیات ظفر' کے نام سے ایک ساتھ شایع ہوئے۔ ذیل کی غزل اسی کلیات سے لی گئی ہے۔ اس غزل میں ان کا خالص ہندوستانی رنگ جھلکتا ہے۔

جا کہیو اُن سے نسیمِ سحر ، مرا چین گیا ، مری نیند گئی
تمھیں میری نہ مجھ کو تمھاری خبر ، مرا چین گیا ، مری نیند گئی

اے بادشہِ خوبانِ جہاں ، تیری موہنی صورت کے قرباں
کہا اُس نے ، پڑی تری جس پہ نظر ، مرا چین گیا ، مری نیند گئی

ہوئی بادِ بہاری چمن میں عیاں ، گل و بوٹے پہ باقی رہی نہ خزاں
مری شاخِ اُمید نہ لائی ثمر ، مرا چین گیا ، مری نیند گئی

نہ حرم میں تمھارا ہے یار پتا ، نہ سراغ ہی دَیر میں ہے ملا
کہاں جا کے میں دیکھوں ، میں جاؤں کدھر ، مرا چین گیا ، مری نیند گئی

یہی کہتا تھا رو رو کے آج ظفر ، مری آہِ رسا میں ہوا نہ اثر
ترے ہجر میں موت نہ آئی مگر ، مرا چین گیا ، مری نیند گئی

معانی واشارات

خوباں	–	خوب کی جمع، خوب صورت وخوب سیرت لوگ۔ یہ لفظ محبوب کے معنی میں واحد بھی استعمال ہوتا ہے
بادشہِ خوبانِ جہاں	–	اچھی صورتوں اور خوبیوں والوں میں سب سے برتر و اعلا
موہنی	–	دل کو لبھانے والی، موہ لینے والی
بادِ بہاری	–	موسمِ بہار کی ہوا
عیاں	–	ظاہر
ثمر	–	پھل

کعبہ

پتا، نشان

بت خانہ

آہ جو معشوق کے دل یا خدا تک پہنچے

مشق و مطالعہ

مندرجہ ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

۱- شاعر نسیمِ سحر کے ذریعے کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟

۲- بادِ بہاری میں بھی خزاں کے ہونے کو کس طرح ظاہر کیا گیا ہے؟

۳- آہِ رسا میں اثر نہ ہونے سے کیا مراد ہے؟

مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

۱- اے بادشہِ خوبانِ جہاں ، تیری موہنی صورت کے قرباں
کہا اُس نے ، پڑی تری جس پر نظر ، مرا چین گیا ، مری نیند گئی

۲- نہ حرم میں تمھارا ہے یار پتا ، نہ سراغ ہی دَیر میں ہے ملتا
کہاں جا کے میں دیکھوں، میں جاؤں کدھر، مرا چین گیا، مری نیند گئی

ظفر کے دیوان سے ذیل کے مقطع والی غزل یاد کیجیے۔

ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانیے گا، ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

اس غزل کی خصوصیات کو ذہن میں رکھیے:

اس کی بحر طویل لیکن مترنم ہے۔ اس کی ردیف ایک طویل فقرہ ہے۔ اندازِ بیان میں سادگی اور برجستگی ہے۔

●●●

ولادت: ۱۸۲۸ء وفات: ۱۹۰۰ء

منشی امیر احمد مینائی لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد [illegible]
سے حاصل کی۔ پھر علمائے فرنگی محل کے شاگرد ہو گئے۔ ان کی طبیعت بچپن ہی سے
شعر و سخن کی طرف مائل تھی اس لیے حضرت اسیر کے شاگرد ہوئے اور [illegible]
لی۔ ۱۸۵۲ء میں واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے لیکن ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ
کو انگریزوں نے معزول کر کے مٹیا برج، کلکتہ روانہ کر دیا تو امیر مینائی ریاست رام پور
چلے گئے۔ یہاں ان کی خوب قدر و منزلت ہوئی۔ وہ رام پور میں تقریباً [illegible] رہے
لیکن بعد میں داغ دہلوی کی دعوت پر حیدرآباد کا سفر کیا۔ جاتے ہی بیمار ہو گئے اور اسی
بیماری میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ذیل کی غزل ان کے کلیات سے لی گئی ہے جس کے بہت سے اشعار زبان زد ہو چکے ہیں۔

ہوئے نام ور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

نہ گل ہیں نہ بوٹے، نہ غنچے نہ پتے
ہوئے باغ نذرِ خزاں کیسے کیسے

ستاروں کی دیکھو بہار آنکھ اٹھا کر
کھلاتا ہے پھول آسماں کیسے کیسے

جگر میں تڑپ، دل میں درد، آنکھ میں نم
ملے ہیں ہمیں میہماں کیسے کیسے

امیر اب مدینے کو تو بھی رواں ہو
چلے جاتے ہیں کارواں کیسے کیسے

معانی و اشارات

[illegible] بے ثباتی [illegible] آدمی بھی ایک
دن فنا ہو جاتا ہے یہاں آسمان سے مراد تارے اور انسان ہیں جو زمین
میں دفن ہو گئے اس لیے زمیں [illegible] کہا ہے

خزاں کا ذکر

مہمان آتے ہیں تو چند دن ٹھہر کے چلے جاتے ہیں مگر ہمارے مہماں
جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔ یہاں لفظ مہماں کو ضرورتِ شعری کے
سبب 'میہماں' باندھا گیا ہے۔

مشق و مطالعہ

(الف) مندرجۂ ذیل سوالوں کے جواب دیجیے۔

۱۔ شاعر نے ستاروں کو کس چیز سے تشبیہ دی ہے؟
۲۔ شاعر نے کیسے کیسے میہماں کسے کہا ہے؟
۳۔ مقطع میں شاعر نے کس تمنا کا اظہار کیا ہے؟

(ب) مطلب بیان کیجیے۔

۱۔ نہ گل ہیں نہ بوٹے، نہ غنچے نہ پتے — ہوئے باغ نذرِ خزاں کیسے کیسے
۲۔ امیر اب مدینے کو تو بھی رواں ہو — چلے جاتے ہیں کارواں کیسے کیسے

●●●

مولانا فضل الحسن حسرت موہانی ۱۸۷۸ء

مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کا شمار صفِ اول کے شعرا میں ہوتا ہے۔ ضلع اناؤ کے قصبے موہان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں اور اعلا تعلیم علی گڑھ یونی ورسٹی میں حاصل کی۔ گوناگوں صفات کے مالک تھے۔ مذہب، سیاست، صحافت، ادب ہر شعبے میں انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ حق گوئی اور بے باکی ان کی شخصیت کا جوہر تھی۔ اردوئے معلیٰ نامی اخبار جاری کیا۔ غالب کے کلام کی شرح بھی لکھی۔ جنگِ آزادی کے سلسلے میں انھوں نے کئی بار قید و بند کی سختیاں جھیلیں لیکن مشقِ سخن جاری رہی۔ ان کے کلام کی چار جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔ ان کی غزلوں میں عشق کا تذکرہ، دوستوں کا شکوہ، احباب کا ماتم، سیاسی بصیرت اور مذہبی وسیع النظری ملتی ہے۔

وفات ۱۹۵۱ء

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بے دلیِ ہم رہاں سے ہم

کچھ ایسی دور بھی تو نہیں منزلِ مراد
لیکن یہ جب کہ چھوٹ چلے کارواں سے ہم

بے تابیوں سے چھپ نہ سکا حالِ آرزو
آخر بچے نہ اس نگہِ بدگماں سے ہم

معلوم سب ہے پوچھتے ہو پھر بھی مدعا
اب تم سے دل کی بات کہیں کیا زباں سے ہم

ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق
پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

حسرت پھر اور جا کے کریں کس کی بندگی
اچھا جو سر اٹھائیں بھی اُس آستاں سے ہم

معانی و اشارات

بے دلی – مایوسی، شوق کی کمی

ہم رہاں – ساتھ چلنے والے

بدگماں – ناراض، غلط خیال رکھنے والا

بے تابیوں سے ...... ہمہ بدگماں سے ہم – ہماری بے قراریوں نے ہمارے دل کی آرزو کو محبوب پر ظاہر کر دیا اور وہ ہم سے پوری طرح بدگمان ہو گیا

مدعا – خواہش

یاس – مایوسی

ہے انتہائے یاس .... جہاں سے ہم – انتہائی مایوسی بھی گویا عشق کی ابتدا ہے کیوں کہ جب عشق ہوا تو مایوسی ہوئی اور اب یہ مایوسی بذاتِ خود عشق کی محرک بن گئی ہے

آستاں – چوکھٹ

مشق و مطالعہ

(الف) ۱- انتہائے یاس اور ابتدائے عشق کو ایک جیسا کیوں کہا ہے؟

۲- دل کی بات زبان سے بیان کرنا کیوں نہیں چاہتے؟

●●●

ولادت: ۱۹۱۹ء

وفات: ۲۰۰۰ء

اسرار الحسن خاں نام اور مجروحؔ تخلص تھا۔ وہ اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی
فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ چلے گئے اور طبابت کی سند حاصل کی۔
جلد ہی طبابت ترک کردی اور شعر و سخن کے ہوکر رہ گئے۔

مجروحؔ سلطان پوری غزل گو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ انھوں نے اس
زمانے میں بھی غزل لکھی جب ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعروں اور ادیبوں نے نظم
لکھنے کو ترجیح دی اور غزل کو فرسودہ اور رجعت پسندانہ صنف کہہ کر اس کی مخالفت کی۔
مجروحؔ نے غزل کی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے بھی اس میں ترقی پسندانہ
خیالات کو پیش کیا۔ ان کے کلام میں جرأتِ رندانہ، سرمستی و سرشاری پائی جاتی ہے۔ لب
و لہجے کی بلند آہنگی، اظہارِ خیال میں بے باکی اور انفرادیت ان کی خاص پہچان ہے۔

مجروحؔ نے اپنی شاعری میں 'قد و گیسو' سے 'دار و رسن' تک کا فاصلہ انتہائی
خوش دلی اور سرشاری کے عالم میں طے کیا ہے۔

***

جب ہوا عرفاں تو غم آرامِ جاں بنتا گیا
سوزِ جاناں دل میں سوزِ دیگراں بنتا گیا

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسمِ چمن
دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

شرحِ غم تو مختصر ہوتی گئی اُن کے حضور
لفظ جو منہ سے نہ نکلا، داستاں بنتا گیا

دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

معانی و اشارات

عرفاں ہونا — حقیقت کا علم ہونا

سوز — جلن، دکھ

جاناں — محبوب

سوزِ جاناں — محبوب (سے جدائی) کا غم

سوزِ دیگراں — دنیا کے دکھی لوگوں کی محرومی کا غم

جب ہوا عرفاں ....دیگراں بنتا گیا — جب غم کی حقیقت معلوم ہوئی تو غم سہنا آسان ہوگیا۔ محبوب کا غم بڑھ کر دنیا کا غم بن گیا۔ قدیم شاعری میں سب سے اہم غمِ جاناں ہوا کرتا تھا۔ ترقی پسندوں نے غمِ جہاں یعنی غریب اور پسے ہوئے لوگوں کے دکھ کا مداوا کرنے کو اہمیت دی۔ فیض نے بھی کہا ہے: "اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا"۔ فیض اور مجروح دونوں ترقی پسند شاعر تھے اس لیے غمِ جہاں کو غمِ جاناں پر ترجیح دیتے تھے

شرحِ غم	-	غم کا بیان یا تفصیل
شرحِ غم تو...... .....داستاں بنتا گیا	-	محبوب کے سامنے غم کا بیان کرنا مشکل تھا۔ اس کیفیت سے لوگوں نے ان کی باتوں کے بھی بہت سے مطالب نکال لیے۔ فیض نے بھی کہا ہے:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

دہر	-	زمانہ، دنیا
جاوداں	-	ہمیشہ رہنے والا، لافانی

(الف) سوالات کے جوابات دیجیے۔

۱- رسمِ چمن میں کون سا انقلاب آیا؟

۲- شرحِ غم مختصر ہو کر بھی داستان کس طرح بن گئی؟

(ب) مجروحؔ سلطان پوری کے مجموعے 'غزل' سے انقلاب کے جذبے کے تحت کہے گئے اشعار یاد کیجیے۔

(ج) اجتماعی عملی کام:

فیض کی 'گزری ہے' ردیف والی غزل تلاش کر کے مجروحؔ کی غزل سے اُس کا موازنہ کرتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کیجیے کہ دونوں کے خیالات اور اندازِ بیان میں کہاں کہاں یکسانیت یا اختلاف پایا جاتا ہے۔

●●●

غزل - ۶

قتیل شفائی

وفات ۲۰۰۱ء

قتیل شفائی ہری پور ہزارہ (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں ادبِ لطیف ... ہیں کے مدیر رہے۔

قتیل شفائی نہایت مقبول اور ہردلعزیز شاعر ہیں۔ ان کے لہجے کی سادگی، سچائی، عام زبان کا استعمال اور عوام الناس کے جذبات و محسوسات کی خوب صورت ترجمانی ان کی مقبولیت کا راز ہے۔ یوں تو انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی مگر ان کا اصل میدان غزل ہے۔ فلمی نغمہ نگاری میں بھی انھوں نے ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ پاکستان کی پہلی فلم 'تیری یاد' سے نغمہ نگاری کا آغاز کیا اور اپنے فلمی سفر میں ڈھائی ہزار سے زاید نغمے لکھے۔ ان کا کلام پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں یکساں طور پر مقبول ہے۔

گرمیِ حسرتِ ناکام سے جل جاتے ہیں
ہم چراغوں کی طرح شام سے جل جاتے ہیں

شمع جس آگ میں جلتی ہے نمائش کے لیے
ہم اُسی آگ میں گُم نام سے جل جاتے ہیں

خود نمائی تو نہیں شیوۂ اربابِ وفا
جن کو جلنا ہو وہ آرام سے جل جاتے ہیں

معانی واشارات

حسرتِ ناکام	کسی چیز کے نہ ملنے کا افسوس، ناکامی کا ملال
گرمیِ حسرتِ ناکام	محبت میں ناکامی کے سبب ہونے والی دل کی جلن اور بے قراری
شمع جس آگ...... جل جاتے ہیں	شمع کے دل میں بھی محبت کی آگ ہے لیکن وہ بھری محفل میں اس کی نمائش کرتی ہے جب کہ ہم محبت کو رسوا کیے بغیر خاموشی سے جل جاتے ہیں
خودنمائی	خود کو نمایاں کرنا، دِکھاوا کرنا
شیوہ	طور، طریق، انداز
اربابِ وفا	باوفا لوگ، سچی محبت کرنے والے
ربطِ باہم	آپسی تعلق، میل جول
آشنا	جان پہچان والا، ملاقاتی

(الف) ذیل کے سوالات کے جواب دیجیے۔

۱- اربابِ وفا کا شیوہ کیا ہے؟

۲- لوگ شاعر کے نام سے کیوں جل جاتے ہیں؟

[illegible] دوسری طرح کہیے۔

[illegible] سے جل جاتے ہیں

[illegible] کی طرح شام سے جل جاتے ہیں

[illegible] شکیل بدایونی کی ایک غزل زبانی یاد کیجیے۔

[illegible] میں کسی چیز کو بہت بڑھا چڑھا کر اس طرح پیش کیا [illegible] پُر زور بنانے کے لیے کسی بات کو بہت بڑھا چڑھا کر [illegible] حقیقت سے بہت دور ہو جائے تو بیان کے اس طریقے کو [illegible] کوئی حد باقی نہ رہے یا [illegible] مبالغہ کہتے ہیں۔ مبالغے کی تین صورتیں ہیں: قرینِ قیاس ہو تو اُسے **تبلیغ** کہتے ہیں، وقوع کا امکان ہو لیکن ہو نہ سکے تو **اغراق** کہتے ہیں اور قرینِ قیاس نہ ہو تو **غلو** کہتے ہیں۔

نصرتیؔ کا ایک شعر دیکھیے:

لگے جوش کھا سر میں پکنے دماغ
زرہ جل کے دینے لگی تن پہ داغ

نصرتیؔ عادل شاہی سلطنت کے درباری شاعر تھے۔ انھوں نے عادل شاہ کی جنگوں کا بیان نظم کی صورت میں کیا ہے۔ اس شعر میں جنگ کا منظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دھوپ کی شدت ایسی تھی کہ گرمی سے سپاہیوں کے دماغ پک گئے اور زرہ اتنی گرم ہوئی کہ تن پر داغ پڑ گئے۔ یہ شعر مبالغے کی ایک مثال ہے۔ اسی قبیل کا ایک شعر دیکھیے۔

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بُھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

یہ جملہ دیکھیے:

اس کی بے سر و پا باتیں سن کر میرا دماغ پک گیا۔

یہاں 'دماغ پک گیا' محاورے کے طور پر استعمال ہوا ہے، جب کہ پہلے شعر میں 'لگے سر میں پکنے دماغ' مبالغے کی صورت میں ہے۔

●●●

ولادت: ۱۹۵۲ء وفات: ۱۹۹۴ء

پروین شاکر کے والد کا نام شاکر حسین تھا۔ وہ ۱۹۴۶ء میں صوبۂ بہار سے کراچی منتقل ہو گئے۔ پروین شاکر وہیں پیدا ہوئیں۔ پروین شاکر کی تربیت اور ادبی ذوق کی نشو و نما میں ان کے نانا حسن عسکری عظیم آبادی کا جو خود بھی شاعر تھے بڑا ہاتھ ہے۔ پروین شاکر نے سولہ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ کالج کے زمانے میں انھوں نے روزنامہ 'جنگ' میں مضامین لکھے اور ریڈیو پاکستان کے لیے ادیبوں اور شاعروں کے انٹرویو بھی لیے۔

انھوں نے سرسیّد گرلز کالج کراچی سے بی.اے. اور ایم.اے. کیا۔ ۱۹۸۲ء میں پاکستان سول سروس کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۸۴ء میں اسسٹنٹ کمشنر آف کسٹمز کی حیثیت سے ان کا تقرر کراچی میں ہوا۔ بعد میں امریکہ کی ہارورڈ یونی ورسٹی سے اسکالرشپ ملنے پر وہ ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۲ء تک امریکہ میں مقیم رہیں۔ وطن میں واپسی کے بعد ۱۹۹۴ء میں ایک سڑک حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا۔

پچیس سال کی عمر میں پروین شاکر کا پہلا مجموعۂ کلام 'خوشبو' شائع ہوا جس پر انھیں 'آدم جی اوارڈ' دیا گیا۔ 'صد برگ' 'خود کلامی' اور 'انکار' اُن کے دیگر شعری مجموعے ہیں۔ ان مجموعوں پر مشتمل ان کا کلام 'ماہِ تمام' کے نام سے شائع ہوا۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں مخصوص نسوانی انانیت سے مملولب و لہجہ ملتا ہے۔ زیادہ تر غزلیں مقطع کے بغیر ہیں۔ ذیل میں ان کی مشہور اور نمائندہ غزل دی جا رہی ہے۔ یہ غزل 'ماہِ تمام' سے لی گئی ہے۔

بارش ہوئی تو پھولوں کے تن چاک ہو گئے
موسم کے ہاتھ بھیگ کے سفاک ہو گئے

بادل کو کیا خبر ہے کہ بارش کی چاہ میں
کیسے بلند و بالا شجر خاک ہو گئے

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

لہرا رہی ہے برف کی چادر ہٹا کے گھاس
سورج کی شہ پہ تنکے بھی بے باک ہو گئے

بستی میں جتنے آب گزیدہ تھے سب کے سب
دریا کے رخ بدلتے ہی تیراک ہو گئے

جب بھی غریبِ شہر سے کچھ گفتگو ہوئی
لہجے ہوائے شام کے نمناک ہو گئے

معانی و اشارات

سفاک – بے درد، بارش کی تیزی اور نمی نے پھولوں کو چاک کر دیا اس لیے موسم کو سفاک کہا ہے

بادل کو کیا خبر...... خاک ہو گئے – بارش کا انتظار کرتے کرتے درخت سوکھ گئے اور بادل کو فکر اور خبر نہ ہوئی۔ اہلِ حکومت کو نہ فکر ہے نہ خبر کہ ضرورتیں پوری نہ ہونے پر بڑے تہذیبی مرکز اور خاندان ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں

لہرا رہی ہے برف کی چادر ہٹا کے گھاس – سورج نکلنے پر برف پگھلی تو گھاس نظر آنے لگی۔ گھاس کو آزاد ہونے کے لیے سورج کی گرمی کی ضرورت تھی۔ آزادی اور بے باکی کے پس پشت کوئی قوت کام کرتی ہے۔

ش ہوئی تو پھولوں کے تن چاک ہوگئے
م کے ہاتھ بھیگ کے سفاک ہوگئے

بادل کو کیا خبر ہے کہ بارش کی چاہ میں
کیسے بلند و بالا شجر خاک ہوگئے

و کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہوگئے

لہرا رہی ہے برف کی چادر ہٹا کے گھاس
سورج کی شہ پہ تنکے بھی بے باک ہوگئے

ستی میں جتنے آب گزیدہ تھے سب کے سب
دریا کے رُخ بدلتے ہی تیراک ہوگئے

جب بھی غریبِ شہر سے کچھ گفتگو ہوئی
لہجے ہوائے شام کے نم ناک ہوگئے

معانی و اشارات

سفاک — بے درد، بارش کی تیزی اور نمی نے پھولوں کو چاک کر دیا اس لیے موسم کو سفاک کہا ہے

بادل کو کیا خبر...... خاک ہوگئے — بارش کا انتظار کرتے کرتے درخت سوکھ گئے اور بادل کو فکر اور خبر نہ ہوئی۔ اہلِ حکومت کو نہ فکر ہے نہ خبر کہ ضرورتیں پوری نہ ہونے پر بڑے تہذیبی مرکز اور خاندان ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں

لہرا رہی ہے برف کی چادر ہٹا کے گھاس — سورج نکلنے پر برف پگھلی تو گھاس نظر آنے لگی۔ گھاس کو آزاد ہونے کے لیے سورج کی گرمی کی ضرورت تھی۔ آزادی اور بے باکی کے پس پشت کوئی قوت کام کرتی ہے۔

آب گزیدہ - پانی کے کاٹے ہوئے [illegible] پانی سے [illegible]

دریا کے رُخ بدلتے ہی تیراک ہو گئے - سنگین حالات میں [illegible] سازگار ہوتے ہی [illegible] اشارہ ہے [illegible] بھاگ جاتے ہیں اور حق کا [illegible] ختم ہوتے ہی [illegible] مسیحائی کے دعوے کرنے لگتے ہیں

غریب شہر - شاعر نے خود کو غریبِ شہر کہا ہے۔ عربی میں غریب کے معنی [illegible] وطن سے دور شخص کے ہوتے ہیں

مشق و مطالعہ

(الف) مندرجۂ ذیل سوالات کے جواب دیجیے۔

۱- موسم کے ہاتھ کو سفاک کیوں کہا گیا ہے؟

۲- ہوائے شام کا لہجہ نم ناک کیوں ہو گیا؟

(ب) مندرجۂ ذیل شعر کی تشریح کیجیے۔

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

غزل - ۸

بشر نواز

ر نواز کا اصلی نام بشارت نواز خاں ہے۔ مہاراشٹر کے مشہور تاریخی شہر
رنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی مگر آگے نہیں پڑھ سکے۔
۱۹۵۰ء میں شاعری شروع کی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'رایگاں' ۱۹۷۲ء میں منظر عام
پر آیا۔ ۲۰۰۵ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شایع ہوا۔ ایک اور شعری مجموعہ 'اجنبی سمندر'
۱۹۹۶ء میں چھپا تھا۔ بشر نواز کو ان کی شعری خدمات کے لیے مہاراشٹر اُردو اکادمی کا
خصوصی ریاستی انعام بھی مل چکا ہے۔

بشر نواز نے نظم اور غزل دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی
زیادہ تر نظمیں آزاد یا معرا ہیں۔ جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے ان میں کلاسیکی رچاؤ
کے ساتھ جدید سوچ اور سماجی سروکار کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ساتھ ہی فن کی ناقدری کا
احساس اور جذبات کی نارسائی کا کرب نمایاں نظر آتا ہے۔ اُن کے شعری مجموعے
'رایگاں' کا عنوان بھی اُن کے فن کارانہ کرب کا مظہر ہے۔ ذیل میں درج غزل اسی
مجموعے سے ماخوذ ہے۔

بشر نواز کی غزل ایک دُکھی دل کی صدائے دردناک ہے۔ اس کے تقریباً ہر شعر
میں حالات اور سماج سے گلہ اور شکوہ ملتا ہے۔ اس کی ردیف 'ہو تو کہیں بھی' ایک ایسی
ذہنی کیفیت کو راہ دیتی ہے جو زندگی کے تعلق سے ناآسودگی اور مایوسی سے بھری ہے
چناں چہ ہر شعر اسی موڈ کا حامل نظر آتا ہے اور یہ غزل نظم سے قریب ہو جاتی ہے۔ اس
کے باوجود اس کا ہر شعر انفرادی معنویت رکھتا ہے۔ خصوصاً تیسرا اور چوتھا شعر تو ایک
دوسرے سے متصادم معنی کے حامل ہیں۔ یہ بھی صنفِ غزل کی ایک خوبی ہے کہ اس
میں مختلف و متضاد کیفیات کی سمائی ہوتی ہے اور یہی کیفیتیں دل کو چھو لیتی ہیں۔

جز غم کوئی انعام وفا ہو تو کہیں بھی
کچھ اس کے سوا ہم کو ملا ہو تو کہیں بھی

جینا ہے فقط جلتی ہوئی ریت پہ چلنا
اس راہ میں سائے کا پتا ہو تو کہیں بھی

کس کھیت پہ برسے ہیں لرزتے ہوئے موتی
پل بھر کہیں یہ ابر رُکا ہو تو کہیں بھی

دھو ڈالے ہیں بارش نے در و بام تو سارے
دل سے مگر اک نام مٹا ہو تو کہیں بھی

کیا قیمتِ فن ، دادِ سخن مانگنے جائیں
کچھ جاگتی راتوں کا صلہ ہو تو کہیں بھی

• معانی و اشارات

جز	-	سوائے
لرزتے ہوئے موتی	-	بارش کے قطروں کے لیے کہا ہے
جاگتی راتوں کا صلہ	-	شعر گوئی میں راتوں کو دیر تک جاگنے کا صلہ

(الف) مندرجۂ ذیل سوالات کے جواب دیجیے۔

۱- شاعر کو وفا کا کیا انعام ملا ہے؟

زندگی کا صلہ کیا ہے؟

- بارش نے کس نام کو نہیں مٹایا؟
- شاعر قیمتِ فن اور دادِ سخن کیوں نہیں مانگنا چاہتا؟
- جاگتی راتوں کا صلہ کیا ہوتا ہے؟

۵۔ ذیل کے شعروں کی تشریح کیجیے۔

(ب)

۱۔ کس کھیت پہ برسے ہیں لرزتے ہوئے موتی
پل بھر کہیں یہ ابر رکا ہو تو کہیں بھی

۲۔ دھو ڈالے ہیں بارش نے در و بام تو سارے
دل سے مگر اک نام مٹا ہو تو کہیں بھی

(ج)

توجہ طلب : اِس غزل کے مطلع میں 'انعام' اور مقطع میں 'صلہ' کے الفاظ آئے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ 'وفا' کے ساتھ 'انعام' اور راتوں کو جاگ کر کی گئی خدمتِ فن کے لیے 'صلہ' کے الفاظ کتنے موزوں اور معنی خیز ہیں۔ الفاظ کے ایسے استعمال کو بیان کی فصاحت کہا جاتا ہے۔ فصاحت سے متعلق مزید معلومات کے لیے شبلی نعمانی کی کتاب 'موازنۂ انیس و دبیر' کے اس حصے کا مطالعہ کریں جس میں انھوں نے فصاحت و بلاغت کی بحث کی ہے۔

●●●

قطعہ

میں نے ہر غم خوشی میں ڈھالا ہے
میرا ہر اک چلن نرالا ہے
لوگ جن حادثوں سے مرتے ہیں
مجھ کو ان حادثوں نے پالا ہے

(نریش کمار شاد)

ولادت: ۱۹۳۵ء

محمد مختار ابن حافظ رحمت اللہ اپنے قلمی نام مدحت الاختر سے مشہور ہیں۔ کامٹی (ضلع ناگپور) میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم حاصل کی۔ ناگپور یونی ورسٹی سے ایم.اے فارسی میں گولڈ میڈل حاصل کیا اور فارسی کے شاعر نظیری نیشاپوری پر مقالہ لکھ کر پی.ایچ.ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ناگپور مہاوِدیالیہ میں شعبۂ اُردو فارسی سے منسلک ہوگئے۔ ۲۰۰۲ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

مدحت الاختر جدید اردو شاعروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکیڈمی کے رکن رہ چکے ہیں۔ انھوں نے مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ کی اردو درسی کتابیں مرتب کی ہیں اور ادارۂ بال بھارتی کی اردو کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے بھی درسی کتب کی تیاری میں حصہ لیا ہے۔ ان کے کلام کے دو مجموعے 'منافقوں میں روز و شب' اور 'میری گفتگو تجھ سے' شایع ہو چکے ہیں۔ ذیل کی غزل 'میری گفتگو تجھ سے' سے لی گئی ہے۔

***

اب اپنے آپ سے رہتا ہوں شرمسار بہت
کیا تھا میں نے کبھی اُس پہ اعتبار بہت

بہت ہے اس کی سخاوت کا شہر میں چرچا
امیرِ شہر کے ہیں حاشیہ نگار بہت

منافقوں کی رفاقت اسے میسر ہے
ملے ہیں اس کو گناہوں کے پردہ دار بہت

معانی و اشارات

[illegible] - بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے والے، خوشامدی

[illegible] - جس کے قول اور عمل میں یکسانیت نہ ہو، [illegible]

سگانِ وظیفہ خوار - (سگ کی جمع سگان) کسی کی بخشش اور کرم پر پلنے والے

مشق و مطالعہ

(الف) مندرجۂ ذیل سوالات کے جواب دیجیے۔

۱۔ شاعر خود سے شرمسار کیوں ہے؟

۲۔ کیا شاعر کو امیرِ شہر کی سخاوت پر یقین ہے؟

۳۔ گناہوں کی پردہ داری کس طرح کی جاتی ہے؟

۴۔ شاعر نے کن کو سگانِ وظیفہ خوار کہا ہے؟

(ب) مدحت الاختر کی اس غزل کا لہجہ 'ہجویہ' ہے۔ ہمارے آس پاس ایسے کردار موجود ہوتے ہیں جن پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ اُن کے قول اور عمل میں تضاد ہوتا ہے اور اسے اپنے جیسے لوگوں کی دوستی اور طرف داری حاصل ہوتی ہے۔ شاعر نے تقریباً ہر شعر میں ایسے ہی منافق شخص کی ہجو کی ہے۔ اس اعتبار سے یہ غزل یک موضوعی ہے لیکن شاعر کے اندازِ بیان نے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کو اس طرح شعروں میں ڈھالا ہے کہ یکسانیت کا احساس مٹ گیا ہے۔

●●●

ولادت: ۱۹۳۸ء وفات: ۱۹۹۰ء

بدیع الزماں خاؔور کا اصلی نام بدیع الزماں پرکار ہے۔ وہ کوکن کی ایک مردم خیز بستی بان کوٹ ضلع رتناگری میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد محمد ابراہیم صوفی بان کوٹی بھی شاعر تھے۔ خاؔور کو اسکول کے زمانے ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ ابتدا میں خاؔور بان کوٹی کے قلمی نام سے لکھتے رہے پھر بدیع الزماں خاور ہوگئے۔ اُن کا پہلا مجموعۂ کلام 'حروف' ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا اور وہ ایک جدید شاعر کی حیثیت سے پہچانے گئے۔ ان کے اُردو کلام کے کل سات مجموعے شائع ہوئے جن میں 'بیاض' 'لفظوں کا پیرہن' اور 'سات سمندر' کے علاوہ وطنی و قومی شاعری پر مشتمل 'میرا وطن ہندوستان' اور کوکن سے متعلق گیتوں اور نظموں کا مجموعہ 'امرائی' شامل ہیں۔

خاؔور کو مراٹھی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ اُنھوں نے مراٹھی کی قدیم و جدید شاعری کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے اور مراٹھی میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ مراٹھی سے ترجمہ کردہ شاعری کے مجموعوں 'خوش بو' اور 'سنبل' کے علاوہ مراٹھی زبان و ادب پر اُن کے مضامین کا مجموعہ 'مہاراشٹر کی ادبی و تہذیبی قدریں' شائع ہو چکا ہے۔ اُن کی مراٹھی غزلوں کے دو مجموعے بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

خاؔور کی کئی کتابوں پر انھیں مہاراشٹر اردو اکادمی کے علاوہ دیگر ریاستوں کی اُردو اکادمیوں نے بھی ادبی انعامات سے نوازا۔ وہ داپولی ضلع رتناگری کے نیشنل اُردو ہائی اسکول میں ٹیچر تھے اور وہیں اُن کا انتقال ہوا۔

خاور کی غزل کی یہ خصوصیت قابلِ ذکر ہے کہ اس میں ردیف بہت مختصر (مجھ) ہے جس کی مناسبت سے قافیے لاکر ہر شعر میں نئی بات کہنے کی کوشش کی گئی

پہلے شعر میں حضرت آدمؑ سے اپنا سلسلۂ وجود جوڑ کر بھی ہر لمحہ خود کو تازہ تر
محسوس کرنے کی بات کہی گئی ہے کیوں کہ ہر نیا پل نئی آرزوؤں اور نئی امیدوں کو
دیتا ہے۔ دوسرے شعر میں رات کی تنہائی اور خوف کی کیفیت کو ایک عذاب کہا ہے۔
شعر میں سایے کا رات کو جدا ہونا ایک مانوس خیال ہے جس سے شعر کی تفہیم
آسان ہوگئی ہے۔ تیسرا شعر فطرت سے خود کو جوڑ کر ذات کو کائنات کے حوالے سے
بیان کرنے کی کوشش ہے جب کہ چوتھا شعر اجتماعی اور شہری زندگی کی ہماہمی اور پرانی
بستیوں کی جگہ نئی عمارتوں کے آجانے سے پرانے طرزِ زندگی کے حامل لوگوں کی
شناخت اور پہچان کے کھو جانے کا المیہ پیش کرتا ہے۔ مقطع میں شاعر نے اپنی شہرت
اور جدید تکنیکی ترقیوں کے سبب اُن کی تصویر کے دور دور تک پہنچنے کا ذکر اس انداز سے
کیا ہے کہ اس میں تعلی ہوتے ہوئے بھی تعلی کا احساس نہیں ہوتا۔

***

تازہ تر لگتا ہے ہر لمحہ وجود اپنا مجھے
کر چکا ہے ورنہ صدیوں قبل وہ پیدا مجھے

اس سے بڑھ کر اور کیا ہو دن کے ڈھلنے کا عذاب
میرے سائے نے بھی چھوڑا رات بھر تنہا مجھے

بھر رہا تھا بادلوں کی شکل میں تیرے لیے
پیاس کی شدت میں لیکن پی گئے صحرا مجھے

بلڈنگوں میں اپنے گھر کا کچھ نشاں ملتا نہیں
در بدر بھٹکا رہا ہے شہر کا رستا مجھے

لوگ خاور آشنا ہیں، میرے چہرے سے وہاں
میری آنکھوں نے جہاں اب تک نہیں دیکھا مجھے

[illegible] ہے۔

مشق و مطالعہ

(الف) ذیل کے سوالوں کے جواب دیجیے۔

۱- شاعر کو ہر لحہ اپنا وجود تازہ تر کیوں لگتا ہے؟

۲- دن ڈھلنے پر کیا ہوتا ہے؟

۳- بادل اور صحرا کی علامتوں کا کیا مطلب ہے؟

۴- شاعر کو اپنے گھر کا نشاں کیوں نہیں مل رہا ہے؟

۵- خاور کے چہرے سے دور دور تک کے لوگ کیسے آشنا ہو گئے ہیں؟

(ب) اس غزل میں ایک تلمیح ، ایک تشبیہ اور ایک استعارہ شامل ہے۔ کیا آپ اُن کی نشان دہی کر سکتے ہیں؟

●●●

رباعیات

رباعی وہ شعری صنف ہے جس میں کسی خیال کا اظہار چار مصرعوں میں کیا جاتا ہے۔ اس میں عموماً پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے میں قافیہ و ردیف کا استعمال [illegible] کے خیال موزوں کیا جاتا ہے لیکن چاروں مصرعوں میں قافیے اور ردیف کی پابندی بھی ملتی ہے۔ رباعی بحر ہزج کے چوبیس مخصوص عروضی اوزان میں کہی جاتی ہے۔ اس کے چاروں مصرعے ایک ہی وزن میں یا قدرے الگ الگ اوزان میں ہو سکتے ہیں۔ البتہ ماہرین نے 'لاحول ولا قوۃ الا باللہ' کے وزن کو رباعی کا بنیادی وزن کہا ہے۔

رباعی میں عموماً حکیمانہ موضوعات پر خیال پیش کیا جاتا ہے۔ رباعی گو شعرا پہلے دو مصرعوں میں متوازی بیانات دیتے ہوئے تیسرے مصرعے میں بات کو قدرے ٹھہراو کے ساتھ ایک موڑ دے دیتے ہیں اور چوتھا مصرع اس زوردار طریقے سے موزوں کرتے ہیں گویا ایک فیصلہ کن بات کہہ رہے ہوں۔

رباعی کی ایجاد کا سہرا فارسی شاعر رودکی کے سر باندھا جاتا ہے البتہ عمر خیام محض اپنی رباعیوں کی بنا پر شہرۂ آفاق شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اُردو کے قدیم و جدید شعرا نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ بیسویں صدی میں اکبرؔ، اقبالؔ، فانیؔ، رواںؔ، امجدؔ، حالیؔ، جوشؔ، فراقؔ، یگانہؔ، اخترؔ انصاری، جاں نثار اخترؔ وغیرہ نے رباعیاں کہی ہیں۔

ذیل میں میر انیسؔ، میر کاظم علی برقؔ، شادؔ عظیم آبادی، عبدالباری آسیؔ اور جاں نثار اخترؔ کی رباعیاں دی گئی ہیں۔

***

(۱)

میر انیس

اں کوئی کب جوہر ذاتی کا ہے
کل کو گلہ کم اتفاقی کا ہے
بنم سے جو وجہِ گریہ پوچھی تو کہا
رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے

**

(۲)

میر کاظم علی برقؔ

میت تھی کل ایک سرِ راہ گزار
تابوت کو دیکھا تو ہوا میں ہشیار
اے برقؔ حقیقت ہے یہ افسانہ نہیں
اک خفتہ نے خفتہ کو کیا ہے بیدار

**

(۳)

شادؔ عظیم آبادی

ہے دور کبھی دن کا کبھی یاں شب ہے
گردش کا زمانے کی یہی مطلب ہے
ہم تم نہ رہیں گے ورنہ دنیا ساری
تا حشر یوں ہی رہے گی جیسی اب ہے

ی۔ شبنم کو بھی اپنے فنا ہونے کا [illegible]

(قلیل ہے)

(۳)

تابوت – جنازہ

خفتہ – سویا ہوا

بیدار – جاگا ہوا

آخری مصرع میں پہلی بار لفظ خفتہ سے مراد مرا ہوا انسان ہے او

دوسری بار لفظ خفتہ سے مراد حقیقت سے لاعلم آدمی ہے

(۴)

بزمِ دہر – دنیا

(۵)

کفایت – بچت

شعور – عقل، سلیقہ

گن – خوبی

تنگی – پیسے کی کمی، غریبی

مشق و مطالعہ

- میر انیسؔ کی رباعی میں ناقدری کا شکوہ ہے اور فنا ہونے کے غم کا اظہار ہے۔
- کاظم علی برقؔ نے انسان کو آگاہ کیا ہے کہ زندگی بہرحال فنا ہونے والی ہے اس لیے اپنے فرائض اور عمل کو انجام دینے میں کوتاہی نہ کرے۔
- شادؔ نے اپنی رباعی میں کہا ہے کہ انسان کی زندگی میں نشیب و فراز آتے ہیں لیکن دنیا کا کاروبار جاری رہتا ہے۔
- عبدالباری آسیؔ نے یہ واضح کیا ہے کہ خوشی بغیر جدوجہد کے نہیں ملتی۔
- جاں نثار اخترؔ نے عورت کے حسنِ انتظام، گرہستی کی خوبی اور قربانی کو ظاہر کیا ہے۔

چنگیز خان کی فوج کشی

محمد فضل الرحمان

ولادت: ۱۹۰۱ء

محمد فضل الرحمان کی ولادت حیدرآباد میں ہوئی۔ نظام کالج حیدرآباد اور دکن کالج پونہ میں تعلیم حاصل کر کے بمبئی یونی ورسٹی سے بی۔اے۔ کیا۔ دکن کالج میں فیلو رہے۔ سٹی کالج عثمانیہ یونی ورسٹی میں لکچرار کے فرائض انجام دیے۔ بعد ازاں حیدرآباد حکومت میں ناظم لاسلکی اور ناظم تعلیمات مقرر ہوئے۔ انھوں نے ڈراما نگاری میں کمال حاصل کیا اور متعدد ڈرامے لکھے۔ ان کے کئی ڈرامے اسٹیج کیے گئے اور ریڈیو سے بھی نشر ہوئے۔ ان کا ڈراما 'سقراط' ۱۹۵۴ء میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے شایع کیا گیا۔ 'ظاہر باطن' 'نئی روشنی' 'حشرات الارض' 'آئندہ زمانہ' اور 'کارخانہ' ان کے دیگر مشہور ڈرامے ہیں۔

یہاں ان کے ایک ڈرامے کا کچھ حصہ دیا جا رہا ہے۔ یہ ڈراما چنگیز خان کے بارے میں ہے۔ اس میں پہلا سین چنگیز خان کے مخالف گروہ سے متعلق ہے۔ دوسرے سین میں چنگیز خاں کے حملے کی تیاری اور اس کی فوجی حکمت عملی کا نقشا سامنے آتا ہے۔ تیسرے سین میں علاؤ الدین خوارزم شاہ کی شکست کے بعد اس کی موت کا منظر پیش کیا گیا ہے لیکن اس کی اولاد اور فوج کے سینوں میں وطن پرستی اور آزادی کی جو شمع روشن ہے اس کی روشنی تیز ہوتی دِکھائی دیتی ہے۔ علاؤ الدین کا بیٹا جلال الدین نئے جوش کے ساتھ ایک وحشی طاقت سے مقابلے کا عزم ظاہر کرتا ہے اور ایک خوش حال، پُرامن اور آزاد دنیا کا خواب دیکھتا ہے۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ چنگیز خان کی لڑائی کوئی مذہبی لڑائی نہیں تھی اور نہ ہی اس کا تعلق مذہب اسلام سے تھا۔

(پہلا سین)

(سلطان علاء الدین خوارزم شاہ کے وسیع محل کا خانہ باغ۔ سلطان جس کی عمر اس وقت کوئی پینتالیس سال کی ہوگی، اپنے ولی عہد شہزادہ جلال الدین اور اپنی فوج کے ایک افسرِ اعلا اوزبک سے گفتگو میں مصروف ہے۔ سلطان اور شہزادے کے جسم پر اس زمانے کے رواج کے مطابق اطلس کی قبا اور ریشم کی شلوار ہے۔ سروں پر زر بفت کے شملے جن میں ہیرے جواہر ٹکے ہیں جیسا کہ مشرقی تاجداروں کا عام طریقہ تھا۔ اوزبک فوجی وردی پہنے ہوئے ہے۔ چند پہرے دار خانہ باغ کی دونوں جانب بت بنے کھڑے ہیں۔)

اوزبک : عالی جاہ! چنگیز خان کے بھیجے ہوئے ایلچی دربار میں حاضری دینا چاہتے ہیں۔

علاء الدین : آیندہ ہفتے کے دربار میں انھیں حاضر کردو۔

اوزبک : انھیں واپسی کی بے حد جلدی ہے۔ وہ آیندہ ہفتے تک نہیں ٹھہر سکتے۔

علاء الدین : (چڑ کر) تو کیا وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کے آئے ہیں۔

اوزبک : وہ بجلی کی رفتار سے آئے ہیں اور اسی تیزی سے واپس جانا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ آج سے ساتویں دن قراقرم نہ لوٹیں تو ان کی جانوں کی خیر نہیں۔

تنی دور ہے یہاں سے قراقرم؟

دا کی زمین کو کون ناپ سکا ہے۔ اندازاً دو ہزار میل کا فاصلہ ہوگا۔

فاصلہ وہ سات دن میں طے کر لیں گے؟

ی بتا سکتے ہیں۔ حکم ہو تو انھیں یہیں حاضر کر دوں۔ ڈیوڑھی پر صبح سے

کھڑے ہیں۔

لوا ای خانہ باغ میں ہم انھیں باریاب کریں گے۔ (اوزبک چلا جاتا

ہے) جلال! میں سمجھتا ہوں کہ یہ چنگیز کی طرف سے شکایت لائے ہیں۔

تمھیں یاد ہے ان سوداگروں کا واقعہ؟

جلال الدین: وہ قتل غلطی تھی۔

الدین: سوداگروں کے بھیس میں وہ لوگ جاسوسی کر رہے تھے۔ جاسوسوں کی سزا

موت ہے۔

جلال الدین: اگر وہ جاسوس تھے بھی تو اتنی بھاری سزا دینا بے رحمی تھی۔ ایک دو نہیں

پچاس ساٹھ آدمیوں کو خون میں نہلا دیا گیا۔

الدین: تم کو ابھی حکومت کا تجربہ نہیں۔ جب میری جگہ تخت پر بیٹھو گے تو معلوم

ہوگا کہ جب تک انسانوں کا خون نہ بہے سلطنت کی آبیاری نہیں ہوتی۔

یہ کھیتی لہو اور آنسو کے بغیر ہری بھری نہیں رہتی۔

جلال الدین: (اپنے آپ سے) ایسی کھیتی کا سوکھ جانا ہی بہتر ہے۔

(اوزبک چنگیز کے دونوں ایلچیوں کو لے کر داخل ہوتا ہے)

ازبک: (ایلچیوں سے) بادشاہِ جہاں پناہ، سلطانِ بحر و بر، سکندرِ ثانی، سلطان

ابنِ سلطان حضرت علاؤ الدین خوارزم شاہ (دونوں ایلچی ادب سے سر

دکھاتے ہیں۔

علاء الدین: تم اپنے بادشاہ کی طرف سے کیا پیغام لائے ہو؟

پہلا ایلچی: آسمان پر خدا ہے اور زمین پر خاقان۔ شہنشاہ تاتارستان خان اعظم چنگیز خان کو اس دربار سے شکایت ہے کہ تاتاری سوداگروں کو بے گناہ قتل کروا دیا گیا۔

جلال الدین: تاتاری کیسے؟ وہ تو ہماری قوم سے تھے۔

دوسرا ایلچی: ہاں مگر وہ خاقان کی رعایا بن چکے تھے۔ اس لیے ان کے وہی حقوق تھے جو تاتاریوں کے ہیں۔

علاء الدین: وہ لوگ جاسوس تھے اور جاسوسی کی سزا موت ہے۔ وہ سب بے ایمان اسی قابل تھے کہ ان کی گردنیں اُڑا دی جاتیں۔ خاقان کے پاس لفظ بہ لفظ یہی جواب پہنچا دیا جائے۔

پہلا ایلچی : عالی جاہ! گستاخی معاف۔ اس جواب سے کہیں دونوں سلطنتوں کی دوستی دشمنی سے نہ بدل جائے۔

جلال الدین: تمھارے خاقان کی سلطنت کتنی وسیع ہوگی؟

دوسرا ایلچی : لاکھوں مربع میل۔ جس وقت سے سلطنت خطا فتح ہوئی ہے آبادی اور دولت کی کوئی حد نہیں۔

اوزبک : خالص صحرائی باشندے کتنے ہیں یہ بتاؤ۔ تاتار، منگول اور دوسرے سب قبائلی۔

پہلا ایلچی : قبائلی بھی تعداد میں چیونٹیوں سے زیادہ ہیں۔

دوسرا ایلچی : اور لڑائی میں شیروں سے بڑھ کے طاقت ور اور شکار میں چیتوں سے

[illegible]

ہزاروں میل کا فاصلہ ہے۔ اگر جنگ چھڑ جائے تو لشکر کو یہاں پہنچتے پہنچتے مہینوں لگ جائیں گے۔ ایسے میں اتنی بڑی فوج کے لیے رسد کا انتظام کرنا بھی کوئی کھیل نہیں۔

[illegible] : ہم نسل اور عقیدے میں تاتاریوں سے الگ ہیں لیکن ان کا نمک کھاتے ہیں اس لیے اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتے۔

[illegible] : کہو کہو! کچھ تمھارے کہنے سے ان پر آفت نہیں آ جائے گی۔ نہ ان کے سروں پر آسمان ٹوٹ پڑے گا اور نہ ان کے قدموں تلے زمین پھٹ پڑے گی۔

دوسرا ایلچی : ہمیں کہنے میں کوئی عذر نہیں لیکن سننے والوں کو مشکل سے یقین آئے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ لوگ انسان نہیں جن ہیں۔ ان کی فوجوں کو غذا کی ضرورت نہیں۔ جب بھوک لگے گھوڑوں کی رگیں کھول کر خون پی لیتے اور پھر رگ بند کر دیتے ہیں۔

پہلا ایلچی : اور گھوڑوں کو بھوک لگے تو وہ اپنے سُموں سے زمین کھود کر برفیلے میدانوں میں بھی اپنا چارہ آپ حاصل کر لیتے ہیں۔

اوزبک : ان کے عقائد کیا ہیں؟ کیا وہ خدا کو مانتے ہیں یا چاند ستاروں کی پوجا کرتے ہیں؟

دوسرا ایلچی : نہ وہ خدا کو مانتے ہیں نہ خدائی کو۔ وہ سوائے اپنے خاقان کے کسی کی پرستش نہیں کرتے۔ وہی ان کا مالک ہے۔ وہی ان کا پالنے والا۔ وہی

[illegible]

[illegible] : [illegible]

علاء الدین : ان کے جنگی اصول کیا ہیں؟

دوسرا ایلچی : جنگ میں ان کا کوئی اصول نہیں۔ جانوروں کی طرح انسانوں کا شکار کرتے ہیں۔ بچے، بوڑھے، مرد، عورت، ضعیف، اپاہج کسی پر رحم نہیں کھاتے۔ سب کا صفایا کر دیا جاتا ہے۔ کوئی ان بے گور و کفن لاشوں پر رونے والا تک باقی نہیں رہتا۔

اوزبک : خدا پناہ میں رکھے ایسے درندوں سے!

پہلا ایلچی : جس وقت لشکر لے کر نکلتے ہیں تو میلوں اور فرسخوں کی جگہ عرض بلد اور طول بلد کے درجے طے کرتے ہیں۔ جو شہر راستے میں ملے وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ دریا اپنا رخ بدل دیتے ہیں۔ جنگل فراریوں اور زخمیوں سے آباد ہو جاتے ہیں۔

دوسرا ایلچی : اور جس مقام سے ان کا گزر ہوتا ہے وہاں کی زمین پر مردے کھانے والے بھیڑیوں، گیدڑوں اور گدھوں کے سوا کوئی جان دار نظر نہیں آتا۔

پہلا ایلچی : مختصر یہ کہ ان کی آمد پر قیامت سے پہلے قیامت آ جاتی ہے۔

علاء الدین : (غصّے سے) پھر تو وہ دجال ہیں۔ اور تم روٹی کے ٹکڑے کے لیے سیدھا راستا چھوڑا کر ان کی اُمت میں جا ملے ہو (اوزبک سے) لے جاؤ ان غداروں کو!

(اوزبک اور دو پہرے دار ایلچیوں کو لے کر باہر چلے جاتے

ہیں۔ کچھ دیر بعد پھر سے وار واپس آ کر ایلچی تک۔ لڑ سے ہو جاتے ہیں
لیکن اوزبک واپس نہیں آتا۔)

وہ اپنے مالک کے وفادار خادم ہیں۔ غدار کیسے ٹھہرے؟

ان کا مالک انسانیت کا دشمن ہے اور اس کے تمام خادم نوع انسانی کے
غدار۔

بابا جان! یہ لوگ یہاں سے جا کر اس برتاؤ کا چرچا کریں تو کیا نتیجہ ہوگا؟

یہ لوگ یہاں سے واپس نہیں جائیں گے۔

سوداگروں کے قتل کے بعد یوں بھی ان کا بادشاہ مشتعل ہے۔ اب ان
ایلچیوں کو قید کرنا گویا جلتی آگ پر تیل چھڑکنا ہے۔

وہ ایلچی قید میں نہیں رہیں گے بلکہ زندگی کی قید سے رہائی پالیں گے۔

پھر تو جنگ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

جنگ کے لیے اور فتح کے لیے ....

(مولانا نورالدین داخل ہوتے ہیں۔ مولانا کی عمر پچاس کے لگ بھگ
ہے۔ ڈاڑھی مونچھوں میں کچھ سفید بال آ گئے ہیں۔ سر پر عمامہ اور بدن
پر عبا ہے۔)

........آیئے مولانا میں آپ ہی کا منتظر تھا۔ کہیے بغداد سے کیا خبر لائے
ہیں؟ دربارِ خلافت کے کیا حالات ہیں؟

خلیفہ ناصر کے دربار کے حالات ناگفتہ بہ ہیں۔ گو کئی پشتوں سے
سلطنت برائے نام رہ گئی ہے لیکن اب بھی وہ عوام کی عقیدت کے
سہارے فرعونِ بے سامان بنا بیٹھا ہے۔

جلال الدین	کیا آپ کی رسائی وہاں تک ہوئی؟

نور الدین	یہ کیسے ممکن تھا۔ بڑے بڑے بادشاہوں کی وہاں تک رسائی نہیں۔ وہ بھی آستانہ چوم کر لوٹ جاتے ہیں۔ کیسے خدا ہے بندے سے [illegible] بند ہے۔

جلال الدین: یہ خود ساختہ خدا بندوں سے زیادہ عاجز ہے۔

نور الدین : اس پر بھی بغداد کے جہلا اس کی پوجا کرتے ہیں۔

علاء الدین : بغداد کے علما کا کیا رنگ ہے؟

نور الدین : ان کا رنگ گرگٹ کی طرح ہر وقت بدلتا رہتا ہے۔ گھڑی میں کچھ گھڑی میں کچھ۔ کوئی ایک رنگ نہیں۔ ہوا کے رخ کے ساتھ ان کی رائے میں تبدیلی ہوتی ہے۔ جدھر ناصر کا رجحان دیکھتے ہیں فتوے صادر کر دیتے ہیں۔

جلال الدین: اور شہر کے ادیب اور شاعر؟

نور الدین : ان کی عمریں جھوٹے قصیدے لکھنے میں برباد ہو رہی ہیں۔ جس ٹُٹ پونجیے کے پاس دو چار گانو کا علاقہ ہو وہ اسے شہنشاہوں سے بڑھا دیتے ہیں۔ سکندر صولت، دارا حشمت، جم مرتبت، فخر فریدون و افراسیاب، رشکِ کیقباد و اسفندیار، اور نہ جانے کیا کیا......اور جب ان قصیدوں پر بھی انعام نہیں ملتا تو پھر اس کی ہجو لکھ کر طنز و حقارت کے زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی اس پر بوچھار کر دیتے ہیں۔

علاء الدین : خیر ان لوگوں سے ہمیں کیا لینا ہے۔ فوج کے سرداروں کی بابت سنائیے۔ کیا ان پر بھروسا کیا جا سکتا ہے؟

وہ ایلچی ہے [illegible] ایک سازشی ہیں۔ مجھے خبر ہے وقت آنے کو
ناصر کو تخت سے اتار کر آپ کے نامزد کردہ خلیفہ کو بٹھا دیں گے۔ ناصر
[illegible] سمجھتے ہیں کہ آپ کی طاقت توڑنے کے لیے چنگیز سے مدد مانگے۔
[illegible] درست ہے کہ بغداد کے ایلچی مجھ سے خلاف مدد مانگنے کے لیے
خوارزم روانہ کیے گئے ہیں۔
بالکل صحیح ہے۔ بغداد کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ ناصر تاتاریوں سے ساز باز کر رہا
ہے۔
جیسی روح ویسے فرشتے۔
بے وقوف اتنا نہیں سمجھتا کہ غیروں کے بل بوتے پر اپنوں سے لڑنے
والے ایک دن خود غیروں کے غلام بن جاتے ہیں۔ وہ ہماری سلطنت پر
چڑھائی کرنے کے لیے چنگیز کو دعوت تو دے رہا ہے مگر اسے یہ نہیں
معلوم کہ ہمارا زور ٹوٹ جائے تو خود اس کا کیا حشر ہوگا۔
خیر! میں نے بھی ارادہ کرلیا ہے کہ ایک ہی وار میں مشرق اور مغرب
دونوں طرف کے دشمنوں کا خاتمہ کردوں گا۔
(پہلے سلطان اور اس کے بعد شہزادہ اور پھر پہرے دار اندر محل کی طرف
چلے جاتے ہیں۔ مولانا نور الدین دوسری جانب کے راستے سے باہر
جاتے ہیں۔)

●●●

(دوسرا سین)

(قراقرم کے باہر ایک وسیع میدان میں چنگیز اور اس کے سپہ سالار سوابدای بہادر اور جبی نویان اور اس کا مصاحب خاص بغورچی فوجی لباس پہنے ہوئے لشکر کے کوچ کرنے سے پہلے آپس میں مشورے کررہے ہیں۔ ان سب کے سروں پر خود، جسم پر زرہ بکتر اور ہاتھوں میں بھالے ہیں۔ ان کے ساتھ سلطنت کا وزیر لیوچیسائی اپنی قومی پوشاک زیب تن کیے صلاح مشورے میں شریک ہے۔ پہلے کی طرح پہرے پر کچھ افسر گرز لیے کھڑے ہیں۔ ایک جانب ایک ترخان منگولوں کا علمِ نُہ پایہ ہاتھوں میں تھامے ہوئے ہے۔)

چنگیز : خوارزم شاہ نے لڑنا پسند کیا۔ اب جو گزرنے والا ہے وہ گزرے گا اور کیا گزرے گا اس کا کسی کو علم نہیں۔

لیوچیسائی : لڑائی کا راستہ اختیار کرکے سلطان اپنی موت کو بلاوا دے رہا ہے۔ کاش وہ صلح و آشتی کا پیام دیتا۔

جبی نویان : صلح و آشتی کا اب موقع نہیں رہا۔

سوابدای بہادر: خاقان کے حکم سے تمام صحرائی قبیلوں کے جاں نثار اکٹھے ہوگئے ہیں اور طبلِ جنگ پر چوب پڑنے کی دیر ہے کہ لاکھوں سپاہیوں کا انبوہ ایک جسم کی طرح حرکت کرنے لگے گا۔

بغورچی : جوان اور بوڑھے سب کے سب اپنے مالک پر فدا ہونے کے لیے بے چین ہیں۔

سوابدای بہادر: جہاں شہنشاہ کا پسینا ٹپکے وہاں ہم اپنا خون بہادیں گے۔

[illegible]: اپنے خون سے زیادہ ہمیں دشمن کا خون بہانا ہے۔ اس کے شہروں کو آگ لگانا ہے۔ اس کے کھیتوں اور کھلیانوں کو راکھ کا ڈھیر بنانا ہے تاکہ آگ اور خون کے طوفان سے کوئی فرد بشر بچنے نہ پائے اور جو بچے تلوار اس کا کام تمام کر دے۔ ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ جس قوم پر فوج کشی کر رہے ہیں اس قوم کا بیج دنیا میں نہ رہے۔

یوچائی: یہ فوج کشی نہیں نسل کشی ہوگی۔

جبی نویان: فوج کشی نسل کشی ہی کا دوسرا نام ہے۔ جب دو دنیاؤں میں ٹکر ہوتی ہے تو کسی ایک کا فنا ہونا قدرتی امر ہے۔

چنگیز: جس طرح آسمان پر دو آفتاب نہیں رہ سکتے اسی طرح زمین پر دو بادشاہ حکومت نہیں کر سکتے۔

سوابدائی بہادر: روئے زمین پر صرف ایک ہی بادشاہ حکومت کرنے کا حق دار ہے اور وہ ہے ہمارا خاقان! تاجوں اور تختوں کا مالک! تمام نسلِ آدم کا شہنشاہ!

یوچسائی: عالی جاہ کی غیر موجودگی میں سلطنت کا انتظام کس کے سپرد رہے گا؟

چنگیز: ہم اس غرض کے لیے ایک مجلس بنا دیں گے۔ جس طرح ملک خطا پر ہماری جانب سے حکومت کرنے کے لیے مقولی اور دوسرے سردار مقرر ہیں اسی طرح دشت گوبی کے انتظام پر ہمارے نمایندے مامور رہیں گے۔

سوابدائی بہادر: شہزادوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟

چنگیز: جوجی کو سیر و شکار کا میرِ سامان بنایا جاتا ہے۔ چغتائی امیر سیاست اور اوگدائی امورِ سلطنت کا نگران رہے گا۔

جبی نویان: جن امیروں کی طرف سے شبہ ہے کہ وہ ہماری غیر موجودگی میں بغاوت

کی آگ بھڑکائیں گے حکم ہو تو ان کو (جھجکتے ہوئے) ٹھنڈا کر دیا جائے۔

چنگیز : ان طریقوں سے امن قایم نہیں رہ سکتا بلکہ بدامنی اور بڑھے گی .... قتلِ عام غیروں کے واسطے ہے اپنی قوم کے لیے نہیں۔

سوابدای بہادر: حضور بجا فرماتے ہیں۔ ایک بار تاتاریوں کی تلوار تاتاریوں کی گردن پر چلنے لگے تو سارے دشت گوبی میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔

لیو چسائی : فدوی کی رائے میں ایسے مشتبہ سرداروں کو دور دور کے علاقوں میں پھیلا دینا چاہیے تاکہ پائے تخت میں کوئی فتنہ کھڑا نہ کر سکیں۔

جبی نویان : مجھے وزیر کی اس تدبیر سے اتفاق نہیں۔ میری رائے میں جتنے سرکش سردار ہیں ان سب کا سر کچل دینا چاہیے۔

چنگیز : ایک سے ایک بڑھ کے خطرناک تجویز ہے۔ ارے کام وہ کرنا چاہیے کہ سانپ مرے لاٹھی نہ ٹوٹے۔ کسی کا سر کچلنے کی ضرورت نہیں۔ سب کو ہمارے ساتھ چلنے کا حکم دے دیا جائے۔

لیو چسائی : بہترین تدبیر ہے۔ حضور کی آنکھوں کے سامنے رہ کر کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہوگی۔

بغورچی : زخمیوں کی مرہم پٹی اور بیماروں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟

لیو چسائی : ملک خطا کے ایک ہزار طبیب میری نگرانی میں یہ خدمت انجام دیں گے۔

(ایک افسر داخل ہوتا ہے)

افسر : جہاں پناہ! کل رات کئی جگہ پالا پڑا ہے۔ گلی کوچے مکان میدان سب تہ در تہ برف سے ڈھک گئے ہیں۔ لشکر کے نجومیوں کا خیال ہے کہ آج کوچ کرنا مناسب نہیں۔

کیوں آج کوچ کرنے میں کیا حرج ہے؟

[illegible] : برف باری کے بعد سفر کرنا نحس سمجھا جاتا ہے۔ سارے نجومی یہی کہہ رہے ہیں۔

[illegible] : (بگڑ کر) وہ نجومی بے وقوف ہیں۔ ملاؤں کو بڑی بڑی تنخواہیں کیا اسی لیے ملتی ہیں کہ وقت بے وقت منحوس فال نکال کر فوج کو بددل کریں؟

[illegible] : لیو چسائی! تم کہو کیا واقعی برف گرنے کے بعد سفر کرنا منحوس ہے؟

لیو چسائی : جہاں پناہ! عام طور پر یہ شگون برا ہے لیکن اس موقع پر میں اس کو نیک فال خیال کرتا ہوں۔

چنگیز : (خوش ہوکر) سن لیا۔ نجوم اس کو کہتے ہیں۔ پیشین گوئی اس کا نام ہے۔

لیو چسائی : اس برف باری کا مطلب یہ ہے کہ سرد ملکوں کا مالک گرم ملکوں کے بادشاہ پر غالب آئے گا۔

چنگیز : تم ٹھیک کہتے ہو۔ (افسر سے) فوج کو آج ہی کوچ کا حکم دے دیا جائے۔

افسر : بہت خوب (چلا جاتا ہے)

چنگیز : جبی نویان! تم چالیس ہزار سپاہ کے ساتھ طلیشان کی پہاڑیوں کے راستے سے غنیم کے ملک میں گھسو گے۔ جوجی ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر وادیوں کی راہ داخل ہوگا۔ مابدولت فوج کے بڑے حصے کو ساتھ لے کر یہ مہم سر کریں گے۔

جبی نویان : خطا کے دس ہزار جاں نثاروں کو بھی تربیت دے کر دشمن پر آگ برسانے کے لیے کیل کانٹے سے لیس کر دیا گیا ہے۔

چنگیز : یہ تومان خوارزم شاہ کے قلعوں کو مسمار کرنے میں مدد دے گا۔ اس کو اصل

لشکر کے ساتھ رکھا جائے۔ باقی سپاہ............دس دس ہزار کے دستوں میں بٹ کر اپنے اپنے افسر کے تحت کوچ کرے۔

جبی نویان : مردوں کو چولھے چکّی کے بکھیڑوں سے بچانے کے واسطے اس مہم میں ہماری عورتیں بھی ہمارے ساتھ چلنے کی آرزومند ہیں۔

چنگیز : (خفا ہوکر) عورتیں ساتھ چل کر کیا کریں گی۔ میدان جنگ کنگھی چوٹی کے جھگڑے مول لینے کے لیے نہیں ہے۔ ان سے کہو گھر ہی میں رہ کے خیموں کو مردوں کی واپسی کے لیے درست رکھیں۔

سوابدای بہادر: سوال رسد کا بھی ہے۔ دو ہزار میل کا سفر درپیش ہے۔ پانچ لاکھ سپاہ کے لیے خوراک اور دس لاکھ گھوڑوں کے واسطے چارا مہیا کرنا پڑے گا۔ اس برف باری کے موسم میں راستے کی بستیوں اور میدانوں میں اتنی رسد کیسے مل سکے گی؟

چنگیز : اسی لیے میں کہتا ہوں لشکر کو پھیلا دو تا کہ کسی ایک حصے پر بار نہ پڑے۔

بغورچی : مویشیوں کے جو بڑے بڑے گلّے جمع ہیں وہ کئی مہینوں تک کافی ہیں۔

چنگیز : مہینے بھر میں سفر طے ہو لینا چاہیے تا کہ حریف کو خبر ہونے سے پہلے ہم اس پر برق آسا حملے شروع کر دیں۔

جبی نویان : پورا لشکر بگولے کی طرح اُٹھے گا اور آندھی کی طرح چلے گا۔

چنگیز : اور پھر اس آندھی پر پارجامہ کس کے اسے دشمنوں پر چڑھایا جائے گا۔

سوابدای بہادر: جہاں پناہ کے اقبال سے خوارزم شاہ کی رعایا کو اس دنیا میں کہیں پناہ نہ ملے گی۔ کوہ فرغنہ سے بحرِ خزر تک ہم سارے علاقے میں ترکوں کی ترکی تمام کر دیں گے۔

ہر سپاہی خدمت کا پورا پورا حق ادا کرے گا۔

(جذباتی انداز میں) ہو سکتا ہے کہ ہم خود اس مہم سے [illegible] کی واپسی نہ

لوٹیں۔ ایسی صورت میں ہمارے احکام کی اطاعت ہمارے بعد بھی اسی طرح کی

ہونی چاہیے جیسی ہماری زندگی میں۔ ان احکام کا مجموعہ 'یاسا' کہا جاتا

ہے ایک ایک لفظ اہم ہے۔ اس کی بدولت ہم نے آدھی دنیا کی دولت

حاصل کی اور اسی کے طفیل سے ہماری اولاد باقی دنیا پر حکمرانی کرے گی

(چلا کر) جاؤ اور تمام لشکر میں منادی کردو۔ 'یاسا' آسمانی کتاب ہے اور

میں خدا کا بھیجا ہوا ہوں۔ قوموں کو ان کے کرتوت کی سزا دینے قہر الٰہی

بن کر آیا ہوں۔ زمین کی پیٹھ پر زمانے کے عتاب کا تازیانہ لگانے کے

لیے۔ اس جنگ میں نہ ہم کسی کو امان دیں گے نہ کسی سے امان

مانگیں گے۔ جیت اسی کی ہوگی جو بڑی سے بڑی تعداد میں گردنیں

اُڑائے اور فرشِ خاک پر آدم خاکی کا زیادہ سے زیادہ خون بہائے۔

(نقارے پر چوب پڑنے کی آواز آتی ہے۔ مختلف جنگی باجوں کی موسیقی)

سوابدای بہادر: لشکر نے کوچ کرنا شروع کردیا۔

چنگیز : (جاتے ہوئے) سب کام ہمارے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق

ہوں۔

(چلا جاتا ہے)

بغورچی : جس دن کے لیے مدت سے تیاریاں ہورہی تھیں، وہ دن آپہنچا۔ قسمتوں

میں رڈوبدل کرنے کی گھڑی، سلطنتوں کو زیر زبر کرنے کی ساعت۔

(چلا جاتا ہے)

جبی نویان : ہمارا نعرہ ہے تخت یا تختہ! اہلِ زمین خبردار ہو جائیں کہ ایک بار روئے زمین پر زلزلہ پڑنے والا ہے۔

(چلا جاتا ہے)

(لیو چسائی کے علاوہ سب چلے جاتے ہیں)

لیو چسائی : (تنہا) خدا رحم کرے۔ تلوار دیوانوں کے ہاتھوں میں ہے۔

(چلا جاتا ہے)

●●●

(تیسرا سین)

(بحر خزر کے ایک غیر آباد جزیرے پر ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں سلطان علاء الدین خوارزم شاہ بسترِ مرگ پر پڑا ہوا زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ سلطان کے جسم پر پھٹے پرانے کپڑے ہیں۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی ہے۔ آواز بھی کم زور ہو رہی ہے۔ پاس سلطان کا ولی عہد شہزادہ جلال الدین، فوج کا سردار اوزبک اور مولانا نور الدین کھڑے ہیں۔)

علاء الدین : اس غیر آباد جزیرے میں جہاں نہ کوئی چرندہ چرتا دِکھائی دیتا ہے نہ کوئی پرندہ پر مارتا نظر آتا ہے تاتاریوں کے ہاتھ سے تو مجھے پناہ مل گئی لیکن موت کے پنجے سے کہیں چھٹکارا نہیں ..... جلال۔

جلال الدین: ابا جان۔

[illegible] ظالم
جب سے [illegible]
چھوڑوں گا [illegible] دشمن پر [illegible] کرتا ہے
آپ [illegible] ہیں۔ [illegible]
[illegible] مصیبت کے پہاڑ ٹل جاتے ہیں۔
[illegible] ہمت سے [illegible] معمولی
جہاں پناہ کا سایہ صدیوں سال ہمارے سروں پر قائم رہے۔
بیماری ہے۔ چند دنوں میں دور ہو جائے گی۔
معمولی بیماری نہیں اوزبک۔ یہ موت کا مرض ہے۔
یہ
خدا شفا دینے والا ہے۔ اس کی رحمت سے ناامید نہ ہونا چاہیے۔

نورالدین : اگر وہ زندہ رکھے بھی تو میں کس اُمید پر جیوں۔ میں تو اسی وقت مر چکا

علاء الدین : جب دشمن نے مجھے بے تخت و تاج کر کے میری حکومت چھین لی۔ اب
یہ چلتی پھرتی زندہ لاش دنیا میں رہ کے کیا کرے گی۔

نورالدین : ہم گنہ گار بندے اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔

علاء الدین : کیا وہ لاکھوں انسان بھی گنہ گار تھے جو فقط میری رعایا ہونے کے جرم
میں مارے گئے۔ وہ بے گناہ جن کا سب سے بڑا جرم یہی تھا کہ انھوں
نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔

نورالدین : یہ مشیت ایزدی ہے۔ اس میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں۔

جلال الدین: جس ظالم نے یہ ستم ڈھائے ہیں اسی دنیا میں اس کو سزا مل جائے گی۔
میں اس کی سرکوبی کروں گا۔

علاء الدین : اب کیا سرکوبی ہو سکتی ہے۔ جب تمام لشکر غارت ہو گیا۔ اس
بے سروسامانی میں دشمن سے لڑنا قضا سے پنجہ لڑانا ہے۔

اوزلاغ : اگر قدرت نے یاوری کی تو ہم قضا کا بھی منہ موڑ دیں گے۔ ایک لشکر غارت ہوا تو کیا ایسے دس لشکر جمع کر کے شہزادے کے پرچم تلے دشمن کا مقابلہ کریں گے۔

جلال الدین : مرتے دم تک میں اس سے لڑوں گا۔ یا وہ جیتا رہے گا یا میں۔

علاء الدین : چنگیز کو تم مار بھی ڈالو تو کیا ہوگا۔ اس کی جگہ دوسرا چنگیز لے لے گا۔

جلال الدین : ہم اس کا بھی خاتمہ کردیں گے۔ اس کے جانشینوں میں سے کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔

علاء الدین : تم سمجھے نہیں، جلال! میں کچھ اور ہی کہہ رہا ہوں۔ یہاں اس سنسان جزیرے کے اندر، تنہائی کے دن اور پریشانی کی راتوں میں میں اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے کہ میں بھی اپنے دَورِ حکومت میں چنگیز سے کم نہ تھا۔ ہم سب چنگیز ہیں۔ جس کے ہاتھوں میں آمرانہ اقتدار ہو وہ چنگیز ہے۔ چاہے کوئی سلطان کہلائے یا خاقان۔ بادشاہ کا خطاب پائے یا شہنشاہ کا۔ سب اسی حیوانی طاقت کے مظہر ہیں جو دنیا میں بہ زورِ بازو حکمران ہے۔

نورالدین : حضور کی طبیعت ناساز ہے۔ اس لیے ایسے ڈراونے خیالات دل میں آرہے ہیں۔

علاء الدین : تم سمجھتے ہو میرے دماغ پر اثر ہے۔ مگر میں ہوش وحواس میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ مجھ میں اور چنگیز میں کوئی فرق نہیں۔ میں نے بھی بے گناہوں کو قتل کیا ہے۔ یاد کرو شیخ مجد الدین کا واقعہ۔

جلال الدین : اباجان! اب اس الم ناک واقعے کی یاد تازہ نہ کیجیے۔ ہم سب کے دلوں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

دغابازوں نے حضور کو [illegible] تھا۔

وہ جرم آپ سے قصداً سرزد نہیں ہوا تھا۔

بلکہ حاسدوں نے آپ کو دھوکا دیا تھا۔

علاء الدین: وہی ایک جرم نہیں ...... اور بہت سے جرم میں نے کیے ہیں
کئی بے گناہوں کا خون میری گردن پر ہے ...... چنگیز میں اور مجھ میں
کوئی فرق نہیں۔ ...... ہم سب کشور کشاؤں کی خاک میں اسی آگ کی
چنگاریاں بھری ہیں۔ ...... جس کو سلطنت ملے ...... جس کے ہاتھ میں
شمشیر ہو ...... ذرا غور کرو جب سے دنیا بنی ہر ملک اور ہر زمانے میں
کتنے چنگیز پیدا ہوئے اور اگر انسان اپنی فطرت نہ بدلے تو آئندہ کتنے
چنگیز پیدا ہوں گے۔

جلال الدین: ابا جان! ان پریشان خیالات کو دل سے نکالنے کی کوشش کیجیے۔

اوزبک: سلطان، آپ ذرا آرام فرمایئے۔ طبیعت کو سکون ہو جائے گا۔

علاء الدین: یہ شور کیسا۔ ہتھیاروں کی یہ جھنکار کیسی ..... زخمیوں کی یہ پکار؟

جلال الدین: یہ سب کچھ وہم کی کارستانی ہے۔

علاء الدین: عقل کام نہیں کرتی یہ کیسی لڑائی چھڑ گئی جس میں جیتنے والے ہار رہے ہیں
اور ہارنے والوں کی جیت ہو رہی ہے۔

نور الدین: ذہنی کش مکش میں بعض وقت انسان کو کچھ کا کچھ محسوس ہوتا ہے۔

علاء الدین: میں نے رات میں ایک خواب دیکھا تھا ...... چنگیز پہلے تو عام آدمیوں

[illegible] نظر آیا۔ عام آدمیوں کی طرح معمولی [illegible] پھر وہ اونچا ہونے لگا اونچا ہونے لگا۔
یہاں تک کہ اس کا سر آسمان کی چھت سے جا لگا۔ اور پھر وہ پھیلنے لگا ...... ساری دنیا میں پھیلنے لگا...... اپنے قدموں تلے کئی قوموں کو کچلتا ہوا، کئی ملکوں کو روندتا ہوا......... اور پھر میں نے دیکھا کہ یکایک ساری انسانی برادری سوگوار ہے۔ تمام دنیا ایک ماتم کدہ بن گئی ہے۔

جلال الدین: ابا جان۔ آپ ذرا نیند کی طرف دھیان دیجیے۔

علاء الدین: نیند کی فکر نہیں .... حشر تک آرام سے سونا ہے .... ہمیشہ کی نیند .... میں تم سے یہ کہنے والا تھا کہ .... چنگیز کے .... جسم ...... کو ہلاک کرنا......... کافی نہیں .... چنگیز کی .... روح .... کو فنا کردو .... ورنہ وہ خبیث روح .... پھر اس دنیا میں آئے گی .... پھر اندھیرے اُجالے .... بھری آبادیوں پر منڈلائے گی .... پھر وہی قیامت مچے گی .... پھر اسی طرح .... جند .... خجند۔ سمرقند، بخارا، امرو اور کرمان جیسے .... بیسیوں شہر ویران ہوں گے۔
(آگے کچھ کہنا چاہتا ہے مگر زبان رک جاتی ہے اور منکا ڈھل جاتا ہے)
(مولانا نورالدین سلطان کے دل پر کان رکھ کر دیکھ لیتے ہیں کہ اب کچھ باقی نہیں رہا۔ اور پھر منہ پر رومال ڈال دیتے ہیں)

نورالدین: زندگی کی ساری مصیبتوں کا خاتمہ ہوگیا۔

جلال الدین: (آنسو ضبط کرکے) دنیا کی سب سے بدنصیب ہستی آج دنیا سے اُٹھ گئی۔

کہاں وہ چلتا ہوا قصرِ ایران اور کہاں [illegible]
جب جان نکلنے کا [illegible]

خدا مرنے والے کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

جلال الدین : (میت کو کچھ دیر تک دیکھتا رہتا ہے) وہ آنکھیں جو [illegible] کا خواب دیکھتی تھیں، بند ہو گئیں۔ وہ دل جو گردشِ دوران و [illegible] کے منصوبے باندھتا تھا بے حرکت ہو گیا۔ (کچھ دیر خاموشی کے بعد) اوزبک! ابا مرحوم کے کفن دفن کا انتظام کرو۔

اوزبک : (انتہائی یاس و غم سے) میرے آقا! گھر میں کفن کے لیے کپڑا نہیں۔ (جلال الدین مبہوت ہو کر مولانا نورالدین کا منہ تکنے لگتا ہے)

نورالدین : قدرت کی شانِ بے نیازی کے آگے ہم چوں و چرا نہیں کر سکتے۔ وہ جسے چاہے زمین سے آسمان پر پہنچا دے اور جسے چاہے آسمان سے زمین پر گرا دے۔

جلال الدین: (بھرّائی ہوئی آواز میں) انہی کپڑوں سے دفن کر دو۔ جو وہ اس وقت پہنے ہوئے ہیں۔ (اب تک سب ضبط کیے ہوئے تھا لیکن اب رو پڑتا ہے)

نورالدین : (آنسو پونچھ کر) دنیا بھی عجب عبرت کا مقام ہے۔ کل تک جو چار اقلیم کا مالک تھا آج دو گز کفن کا محتاج ہے۔

جلال الدین: (پورے عزم و ہمت کے ساتھ) میرے مرحوم باپ کی روح گواہ رہے، میری شہید بیوی اور معصوم بچے کی روحیں گواہ رہیں، ان لاکھوں بے گناہوں کی روحیں گواہ رہیں جن کے جسم خاک و خون میں سڑ رہے

آج میں اپنے دل کی گہرائیوں سے عہد کرتا ہوں کہ جہاں تک انسانی طاقت سے ممکن ہے آخر دم تک چنگیز کا نام صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کروں گا۔

[illegible] : چاہے وہ لڑائی کے میدان میں مارا جائے یا بستر پر، اپنی ناپاک موت مرے اس کی قبر کا نشان تک دنیا میں باقی نہ رہے گا۔ آنے والی نسلیں اس کے پائے تخت کو صحرائے گوبی کی ریت میں ڈھونڈیں گی مگر کہیں اس کا پتہ نہیں چلے گا۔ اس کی وسیع سلطنت، انسانی ڈھانچوں پر تعمیر کی ہوئی پلید سلطنت، پانی کے نقش کی طرح محو ہو جائے گی۔ مال و دولت، ساز و سامان، گنج اور خزانے سب لٹ جائیں گے، صرف اس قاتل کا افسانہ رہ جائے گا...... آنسو اور خون سے لکھا ہوا افسانہ۔

(جلال الدین کا خاص ملازم مسرور داخل ہوتا ہے)

مسرور : بخارا کے چند شہری چنگیزی لشکر سے فرار ہو کے آئے ہیں اور شہزادے سے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

جلال الدین: مسرور! یہ وقت عرض معروض کا نہیں۔ تم دیکھتے نہیں ہم کس حال میں ہیں۔

مسرور : میں نے ان لوگوں سے کہا۔ مگر انھیں اصرار ہے کہ وہ جو اہم خبر سنانا چاہتے ہیں اسی وقت سرکار کے گوش گزار کریں۔

جلال الدین: وہ کون لوگ ہیں؟

مسرور : ایک بوڑھا سوداگر اور اس کا نوجوان لڑکا اور اس نوجوان کی بیوی۔ ان کا کہنا ہے کہ حضور انھیں جانتے ہیں۔

ابھی ابھی حاضر ہو... (سرور چلا جاتا ہے)

ہمارا میں کوئی زندہ نہیں بچا۔ وہ شہری کس طرح بچ نکلے ہوں گے۔

ابھی پتا چل جائے گا۔

(سرور، مرزا احسان، تحسین اور فرحانہ کو ساتھ لیے آتا ہے۔ یہ تینوں نو وارد جو بہت تباہ حال نظر آتے ہیں، داخل ہوتے ہی ادب سے شہزادے کو سلام کرتے ہیں)

جلال الدین: کون! مرزا احسان، تحسین اور فرحانہ! تم لوگ ابھی زندہ ہو؟

مرزا احسان: حضور کے اقبال سے ایک بہت ہی بڑی خوش خبری لے کے آئے ہیں۔

جلال الدین: مرزا احسان! اس وقت جب کہ ساری دنیا تباہ ہو رہی ہے کون سی خبر دل کو خوش کر سکتی ہے۔

تحسین : عالی جاہ! دنیا کو تباہ کرنے والا خود تباہی کے غار میں ڈھکیل دیا گیا۔

اوزبک : کیا کہا! کیا چنگیز......؟

تحسین : اپنے کیفرِ کردار کو پہنچا دیا گیا۔

نورالدین : ہم یہ کیا سن رہے ہیں۔ ساری دنیا کی طاقتیں جس کو نیچا نہ دکھا سکیں۔

مرزا احسان: موت کے پنجے سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ امیر نہ فقیر نہ تاج وَر نہ گداگر۔

تحسین : ہماری سلطنت کے شہروں کو تاراج کرنے کے بعد جب چنگیزی لشکر خوشی کے شادیانے بجاتا ہوا دشتِ گوبی کو لوٹ رہا تھا اور تمام افسر اور سپاہی فتح کے نشے سے متوالے ہو رہے تھے عین اس جشن کے دوران میں فرحانہ کے حسن تدبیر سے..........

جلال الدین: فرحانہ! وطن کی بہادر لڑکی۔ آخر ایسا ناممکن کارنامہ کیسے سرانجام پاسکا؟

احسان : ... مجھے ... داخل ہو جاتا تھا ... مجھے ... ابھی ... سے
... قید میں ہم تینوں کو طرح طرح کی سزائیں دی جاتی تھیں۔ آخر ہم
نے سوچا کہ یہاں ظالم کے قید خانے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دینے
کے بجائے اپنے وطن کے لاکھوں بے گناہوں کے خون کا بدلہ کیوں نہ لیا
جائے۔

اوزبک : قدرت کے عجیب کھیل ہیں۔ جو کام طاقت ور فوجیں نہ کر سکیں وہ ایک
کمزور لڑکی نے کر دکھایا۔

نورالدین : ذرا تفصیلات سنانا۔ کئی برس کے بعد ایسی خبر سننے میں آئی ہے۔

مرزا احسان: تفصیلات بعد میں بیان کریں گے۔ مختصر یہ ہے کہ فرحانہ نے ہمارے
مشورے سے اس شرط پر رضامندی کا حیلہ کیا کہ ہم سب کو رہا کر دیا
جائے اور جب یہ شرط پوری کی گئی تو فرحانہ نے شراب کے پیالے میں
زہر ملا کر اس فتنۂ عالم کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔

جلال الدین: شاباش! زندہ باش!!

اوزبک : پھر تم سب لوگ بچ کے کیسے نکلے؟

تحسین : اس واقعے کی بہت دیر بعد لشکر میں خبر ہوئی۔ دوسرے دن دیر گئے تک
سب اسی خیال میں تھے کہ خاقان عیش کی گھڑیاں گزار رہا ہے اور کسی کی
مجال نہ تھی کہ خیمے میں قدم رکھے۔

احسان : پھر بھی ہم تینوں کو لشکر سے بھاگ نکلنے میں کئی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا،
لیکن حضور کے اقبال سے صحیح سلامت بچ کر آ نکل آئے۔

جلال الدین: یارب تیرا شکر ہے! ابھی میرا جنت نصیب باپ سپردِ خاک بھی نہ ہونے

یہ کر تو نے اس سے سب سے بڑے دشمن کو جہنم میں دھکیل دیا

... مجھے اپنے ملک کو آزاد کرانے میں مدد کرنی چاہیے۔

آپ والد مرحوم کے تمام رسوم آج ہی انجام دلوا دیں ... اور اب

کل ہم یہاں سے روانہ ہوں گے۔ یہ تینوں وفادار جانباز بھی ہمارے ساتھ چلیں گے۔ میں پھر ایک نیا لشکر جمع کروں گا اور نئے عزم اور نئے جوش و خروش کے ساتھ اس سرزمین کو دشمنوں کے ناپاک قدموں سے پاک کرانے کی جان توڑ کوشش کروں گا۔

(سب جانے لگتے ہیں)

(جاتے جاتے) ہمارا خون اور ہمارے آنسو اکارت نہیں جائیں گے۔ اس خون سے ہمارے خاک دان پر نئے نئے گلزار اُگیں گے۔ ان آنسوؤں سے حیات کے نت نئے سوتے پھوٹیں گے۔ تمام برباد کیے ہوئے شہر دوبارہ آباد ہوں گے۔ تمام اُجڑی ہوئی بستیاں پھر سے بسیں گی اور پرانی دنیا کے کھنڈر پر ایک نئی دنیا تعمیر ہوگی۔ ایک خوش حال پرامن اور آزاد دنیا۔

(پردہ)

معانی و اشارات

باریاب کرنا	ـ	حاضر کرنا
اَن داتا	ـ	پرورش کرنے والا
فرسخ	ـ	تین میل کا فاصلہ، فرسنگ

دجال	-	مراد انتہائی ظالم
فرعونِ بے سامان	-	برائے نام حاکم، کمزور شہنشاہ
صولت	-	رعب، دبدبہ
ہجو	-	قصیدے کی ضد، جس میں کسی کی کمزوری بیان کی جائے
علم نہ پایہ	-	بلند پرچم، پرچم جس کی ہم سری نہ ہو سکے
طبلِ جنگ	-	جنگ کا نقارہ
مشتبہ	-	جس میں شبہ ہو، غیر یقینی
ترکوں کی ترکی تمام کردیں گے	-	ترکوں کا غرور ختم کردیں گے
غنیم	-	دشمن
مسمار کرنا	-	ڈھا دینا

جماعت کے طلبہ کے گروہ بنائے جائیں۔ ہر گروہ کو اس ڈرامے کے چند صفحات کے تشریح طلب الفاظ کے معانی لغت میں تلاش کرنے کو کہا جائے۔ استاد اُن کے تلاش کیے ہوئے الفاظ معانی جمع کر کے جماعت میں بحث کرتے ہوئے جہاں ضروری ہو اصلاح کریں اور سلسلہ وار الفاظ و معانی کی فہرست تیار کرائیں۔ سبق میں لفظ جن معنوں میں استعمال ہوا ہے اس کی تشریح سبق خوانی کے دوران کی جائے۔

مشق و مطالعہ

(الف) سیاق و سباق کے لحاظ سے اِن جملوں کا مطلب بیان کیجیے۔

۱- ایسی کھیتی کا سوکھ جانا ہی بہتر ہے۔

۲- جو قوم ظالم کی پرستش کرے وہ دو طرح سے ظالم ہے۔

۳- ان ایلچیوں کو قید کرنا گویا جلتی آگ پر تیل چھڑکنا ہے۔

۴- جابر عوام کی مقبولیت کے سہارے فرعون بے سامان بنا بیٹھا ہے۔
۵- طبلِ جنگ پر چوب پڑنے کی دیر ہے کہ لاکھوں سپاہیوں کا انبوہ ایک جسم کی طرح حرکت کرنے لگے گا۔
۶- روئے زمین پر صرف ایک ہی بادشاہ حکومت کرنے کا حق دار ہے۔
۷- چنگیز کو تم مار بھی ڈالو تو کیا ہوگا۔ اس کی جگہ دوسرا چنگیز لے لے گا۔
۸- کہاں وہ چمکتا ہوا تختِ زریں اور کہاں یہ لکڑی کا ٹوٹا ہوا تختہ۔
۹- دنیا کو تباہ کرنے والا خود تباہی کے غار میں ڈھکیل دیا گیا۔

(ج) ذیل کا اقتباس بآوازِ بلند طلبہ سے پڑھوایا جائے اور اس کے متن پر بحث کی جائے:

کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے کہ میں بھی اپنے دورِ حکومت میں چنگیز سے کم نہ تھا۔ ہم سب چنگیز ہیں۔ جس کے ہاتھوں میں آمرانہ اقتدار ہو وہ چنگیز ہے۔ چاہے کوئی سلطان کہلائے یا خاقان۔ بادشاہ کا خطاب پائے یا شہنشاہ کا۔ سب اسی حیوانی طاقت کے مظہر ہیں جو دنیا میں بہ زورِ بازو حکمران ہے۔

●●●

97) E0 90576

09) E0 89681

74
144
296
74
1036
190
996

VIII IX

VIII IX

64
61
66
66
68
69
68
570
946

مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ آف سیکنڈری اینڈ ہائر سیکنڈری ایجوکیشن، پونہ ۴۱۱۰۱۰

Rs. 28.00

उर्दू कुमारभारती इ. १० वी